

## سر آغاز

بتا تھا تو تخلص مگر پھبتا ہوا تھا ایسا مشہور ہوا کہ اصلی نام کو دور کے رشتہ دار تک بھی نہیں جانتے تھے۔ اور بتا کے نام سے لڑکے شہر کے تمام گلی کو چوں میں جب تک امر دباغز لیں اور واسوخت جوان ہوا تو گیت اور ٹھریاں اور مرے پیچھے بھی مدتوں بعد تک مرثیے اور نوے گاتے پڑے پھرتے تھے۔ ہمارے یہاں کی شاعری میں عشق بازی اور بے تہذیبی کے سوا نہ کیا۔ شریف خاندانوں کے نو جوان لڑکے اکثر اسی مکتب سے خرابی کے لچھن سیکھتے اور اسی اکھاڑے میں برے کرتوتوں کی مشق بہم پہنچاتے ہیں۔ جس شاعری سے ہم بحث کر رہے ہیں اس کے تین درجے ہیں۔ سننا، سیکھنا، کہنا، ان میں سے پہلے دو درجے تو ہمارے طرز تعلیم میں داخل ہیں۔ جس کا شمار پڑھے لکھوں میں ممکن نہیں کہ حرف شناسی کے بعد اس کا پہلا سبق یہ نہ ہو۔

اے داغِ بر دل از غمِ خال تو الہ را  
شرمندہ ساخت آ ہوئے حشمتِ غزالہ را

جن باتوں کی بھٹک کان میں پڑنا نو جوانوں کے حق میں سم قاتل ہے۔ سبقتاً از بر کرائی جاتی ہیں۔ اور جن خیالات کا ایک بار دل میں گزر جانا دنیا و دین دونوں کی تباہی کا موجب ہو سکتا ہے۔ برسوں کی مشق تمرین سے خاطر نشین کیے جاتے ہیں تاکہ طبعی ہو جائیں۔ ناممکن الزوال اور فطری بن جائیں۔ جن کا فلکنا محال ہے چارہ بتا! اس غوم سے مستثنیٰ اس کیلئے سے خارج نہ تھا بلکہ اس پر تو ایک دوسری خفائی بلا مسلط تھی کہ کم بخت صورتِ شکل کا اچھا، رنگ گورا، اعضا کا متناسب یعنی شعر کا موضوع کے واقع ہوا تھا۔ یہ تو عقل میں نہیں آتا کہ تخلص تک نوبت پہنچی ہو۔ اور شعر نہ کہا ہو۔ مگر محسوس مسدس قصیدے اور مثنوی اور واسوخت اور غزل، مرثیہ، ہجو اور رباعی کا کیا مذکور ہم تک تو بتا! کا کوئی مصرع بھی نہیں پہنچا۔ قیاس چاہتا ہے کہ اگر اس نے شعر گوئی کی ہوگی تو اوائل عمر میں کیونکہ تیس برس کی عمر سے تو ہم اس کو خانہ داری کی ایسی مصیبتوں میں پھنسا ہوا پاتے ہیں کہ ایسی حالتِ فراغِ خاطر اور اجتماعِ حواس جو شرط شاعری ہے میسر ہو نہیں سکتا۔ بتا! کے اوائل عمر کا کلام غالب ہے کہ حسن ادا اور شوخی اور زراکت سے خالی نہ ہو اور اس میں تو شبہ ہی نہیں کہ جب وہ مشاعرے میں غزل پڑھتا ہوگا۔ میر انشاء اللہ خاں کی طرح واد واد اور سبحان اللہ اور مکرر پڑھنے کی فرمانشوں کا بڑا اہل ہوتا ہوگا۔ بتا! کا زمانہ کچھ ایسا متقدم نہیں ہے۔ کچھ نہیں تو سو دو سو اس کے دیکھنے والے اب بھی شہر میں زندہ اور موجود ہوں گے۔ پس اگر ہم جستجو کرتے تو اس کا کلام

تھوڑا بہت کسی نہ کسی جگہ سے ضرور ملتا مگر ہم نے اس قصے کے آگے اس کے کلام کا کچھ خیال نہیں کیا۔

## بتا کی ولادت اور طفولیت

نمزل کے اعتبار سے بتا ایک خوشحال باپ کا بیٹا تھا اور چونکہ اکٹھی نو بیٹیوں پر جن میں سے پانچ زندہ تھیں باپ کے بڑھاپے میں بڑی آرزوؤں اور تمناؤں کے بعد پیدا ہوا۔ اس سے بڑھ کر اللہ آمین کس کی ہوگی۔ بیٹے کا ارمان تو شروع ہی سے تھا۔ ہر مرتبہ ملنے جلنے دیکھنے بھالنے والے مولوی، ملا، نجومی رمال حتیٰ کہ دائی جی کے خوش کرنے کو کہہ دیا کرتے تھے، کہ اب کے ضرور بیٹا ہوگا۔ مگر ایک عمر اسی میں گزر گئی۔ توقع کی ناامیدی کے واسطے، امید لگائی نا کامیابی کے لیے بتا کی نوبت میں تو یاس اس درجے کو پہنچ چکی تھی کہ۔ مارے گھر میں کسی کو بیٹے کا۔ مان گمان تک بھی نہ تھا۔ دم کے پانی، تعویذ گندے ٹونے ٹونکے اور دوا اور مل برسوں سے موقوف تھے۔ بتا پیدا ہوا تو سب سے پہلے دائی کو معلوم ہوا کہ بیٹا ہے۔ اس نے اتنی عقل مندی کی کہ لوگوں پر بیٹے کا ہونا فوراً ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ورنہ زچہ جس کو سکون اور قرار درکار تھا مارے خوشی کے پھولی نہ ماتی اور اٹلے لینے کے دینے پڑ جاتے، بارے بتدریج سب کو خبر ہوئی۔ سنتے کے ساتھ جو کھڑا تھا تو کھڑا اور بیٹھا تھا تو بیٹھا جدے میں گر پڑا۔ کسی کے منہ سے دعا نکلی کوئی لگا بے ساختہ زچہ گیریاں گانے، کسی نے دوڑ کر پٹا چٹ زچہ اور بچہ کی بلانیں لے لیں۔ غرض گھر کیا اسی وقت سارے محلے میں شور و غل مچ گیا اور صبح ہوتے ہوتے تو گلی میں ڈولیوں سے اور گھر میں بیبیوں سے تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ ہر چند بیٹے کا ارمان اس بلا کا تھا کہ کیسا ہی بد صورت بیٹا ہوتا چوم چاٹ کر ماتھے چڑھاتے۔ مگر اس خاندان میں ہمیشہ سے صورتوں سے پر چول رہا کرتی تھی۔ گھر میں جو آتا بچے کو دیکھنا چاہتا۔ یہ لوگ پرچھاویں اور نظر کے ڈر سے اس کے دکھانے میں مضائقہ کرتے تھے۔ جب بیبیوں کا بہت تقاضا ہوا اور گرمی پڑنے لگی تو زچہ کے پاس گھر کی کوئی عورت بیٹھی تھی۔ اس نے کہا خدا کے لیے بیسیو ذرا ہوا کا رخ چھوڑو کہ دم گھٹا جاتا ہے۔ مرد بچے کی صورت کیا دیکھنا ہے۔ خدا عمر دے پروان چڑھائے، الہی ماں باپ کا کلیجہ ٹھنڈا رہے۔ ایک بی بی باوجودیکہ خود بھی بچہ کرنے والیوں میں تھیں بول اٹھیں، لوگو بھیر کیا لگائی ہے۔ اللہ رکھے پانچ بہنوں کا بھائی ہے۔ انیس بیس کے فرق سے اپنی بہنوں سے ملتا ہوگا۔ اتنے میں دائی اندر سے نکلی تو ساری بیبیوں نے اس کو گھیر لیا۔ کیونکہ بوا بچہ پورے دنوں کا صحیح سلامت تو ہوا۔ دائی ہاں پورے دن بھی کیسے خوب بھرپور ہاتھ پاؤں، بال، ناخن، سب خاصے تو انا ماشاء اللہ پڑے۔ اور ان کے جتنے بچے ہوئے سب اسی طرح کے خدا کے فضل سے کوکھ بہت صاف ہے۔ بیبیاں کیوں بوا بہنوں میں ملتا ہوا تو ہے۔ دائی بہنوں کی اس سے کیا نسبت لڑکیاں بھی اچھی صورت کی ہیں۔ مگر اس سے پہلے دواڑکیاں کہ ایک دو مہینے کی ہو کر اتر گئیں۔ اور دوسری دوسوا دو برس کی بس دونوں آفتاب ماہتاب تھیں۔ اور یہ خدا جیتار کھے نور کا پتلا

بے۔ بڑی بڑی غلامی آنکھیں، اونچی اورستی ہوئی ناک، پتلے ہونٹ، جھوٹا دہانہ، چمکتے ہوئے سیاہ گھونگروالے بال، کتابی چہرہ، صراحی دار لمبی گردن، سانچے میں ڈھلا ہوا بدن، میری اتنی عمر ہونے کو آئی۔ تیردہ برس کی بیاہی آئی تھی۔ تب سے اپنی ساس کے ساتھ یہ کام کرنے لگی۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے اتنے بچے میرے ہاتھ سے ہوئے کہ جن کا شمار نہیں، مگر ایسا قبول صورت بچہ میں نے تو بڑے بڑے نامی گرامی امیروں کے باں بھی جن کے حسن کی آج بڑی دھاک بے نہیں دیکھا۔ بات یہ ہے کہ اللہ عمر دے اور بھانگوان ہو۔ سب نے کہا آئین۔ بتلا کے پیدا ہونے کی روداد جو ہم نے اوپر بیان کی اس سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ بتلا کے ساتھ ماں باپ اور عزیز واقارب نے کیا کچھ چو نچلے نہ کیے ہوں گے۔ غرض وہ تمام خاندان اور سارے کنبے میں ایک انوکھی چیز سمجھا جاتا تھا۔ جس جس پہلو سے دیکھئے وہ انوکھی چیز تھا بھی۔ جب سے پیدا ہوا سارے سارے دن ساری ساری رات گودوں ہی میں رہتا۔ نہالچے پر لٹانے کی نوبت نہ آئی تھی۔ اپنے ہی گھر میں ماں، مانی، خالہ، ممانی ایک کم آدھی درجن سگی بہنیں۔ اتنے آدمی لینے والے تھے کہ ایک سے ایک چھینے لیتا تھا۔ باپ کا یہ حال کہ جتنی دیر ممکن تھا، گھر میں رہتے یا پیش نظر رکھتے۔ بتلا کے پہلے پانچ بلکہ سات آٹھ برس کی زندگی یعنی جب تک وہ ممتاز پرورش رہا اس قابل ہے کہ مستثناً ان حالات کی ایک کتاب لکھی جائے مگر ہم کو تو اس کے دوسرے ہی معاملات سے بحث کرنی ہے۔ اس کی پرورش کے متعلق ہم اتنا ہی لکھنا کافی سمجھتے ہیں کہ اگرچہ خاندان کے لوگ سب کے سب دین کے پابند نہ تھے۔ مگر بتلا کا باپ بڑا نمازی اور پرہیز گار آدمی تھا۔ مولوی شاہ حجت اللہ صاحب کے وعظ سے اس کو ایسا عشق تھا کہ آدھی جائے۔ مینہ جائے، طبیعت درست ہو نہ ہو جہاں سنا کہ مولوی صاحب کا وعظ ہے، سب سے پہلے موجود۔ گھر کی بڑی بوڑھیاں بھی نماز پڑھتی تھیں۔ باہمہ جو احتیاطیں بتلا کی پرورش میں برتی جاتی تھیں۔ ان سے ایسا مستنبط ہوتا تھا کہ ان لوگوں کے پندار میں بتلا کی تندرستی نہ صرف غذا سے اور آب و ہوا سے بلکہ مکان سے برسوں سے مہینوں سے۔ دنوں سے، میل و نہار کے خاص خاص اوقات سے اپنے بیگانے کی نگاہ سے آئے گئے کی پرچھائیں سے، لوگوں کی باتوں سے، دلی خیالات سے، تنہائی سے، تاریکی سے، چاندنی سے۔ کسوف خسوف سے، کتے سے بلی سے، چھپکلی سے، دیو سے، بھوت سے، جن سے، پری سے، غرض ہر چیز سے جو واقعی ہے اور ہر چیز سے جو ادعائی ہے۔ معرض خطر میں ہے ہم تو معاذ اللہ کسی کلمہ گو مسلمان پر کفر اور شرک کا الزام کیوں لگانے لگے۔ مگر بہ مجبوری اتنی بات کہنی پڑتی ہے کہ بتلا کے ساتھ جو برتاؤ کیے جاتے تھے۔ واہمہ شرک اور مطمئنہ کفر سے خالی نہ تھے۔ یہ بات کہ جس خدا نے ہم کو پیدا کیا ہے وہی ایک وقت مقررہ تک جس کا حال اسی کو معلوم ہے۔ ہماری زندگی اور تندرستی کی حفاظت کرتا ہے۔ اور جس طرح بدون اس کے فضل و کرم کے ہم دنیا میں رہ بھی نہیں سکتے تھے۔ سوتے جاگتے چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے کہیں اور کسی حالت میں ہوں۔ ہم اس کی پناہ

میں ہیں اور اس کا سایہ رحمت ہمارے سر پر ہے۔ وہ ہر مرض میں ہمارا طبیب ہے۔ اور ہر مصیبت میں ہمارا معین و مددگار۔ ہر تکلیف میں ہمارا غم گسار، بدون اس کی مرضی کے غذا میں تقویت ہے۔ نہ دوا میں تاثیر۔ بغیر اس کے حکم کے نہ ہر زہر ہے نہ اکسیر اکسیر۔ غرض یہ بات ان لوگوں کے معتقدات میں تو ضرور ہوگی جو بتانا کو پال رہے تھے۔ مگر ان کے برتاؤں میں تو کل وانا بت کی کوئی بات ہمارے دیکھنے میں نہ آئی بلکہ ان کی تدبیریں سن کر حیرت ہوتی تھی کہ بتانا کا پانا اور پرورش پانا کیسا یہ گراں جان ان نادان دوستوں کے ہاتھ سے بچ کیوں کر گیا۔ کوئی دکھ، کوئی روگ نہ تھا کہ جس کو یہ لوگ اسباب غلط اور ادعائی نظر آسب و غیرہ کی طرف منسوب نہ کرتے ہوں اور چونکہ تشخیص میں غلطی ہوتی اسی وجہ سے جو تدبیریں کی جاتی تھیں غلط در غلط مگر بتانا خلقنا تو انا پیدا ہوا تھا۔ ہمیشہ اس کی طبیعت امراض پر غالب آتی رہی۔ بہر کیف بتانا کسی نہ کسی طرح خدا کے فضل سے پل پایا کر بڑا ہوا۔ یہاں تک کہ ان گناہیں بھی خیریت کے ساتھ گزرا۔ بتانا کی تعلیم و تربیت سے مستورات کو ظاہر میں تو کچھ سروکار نہ تھا۔ ہر چند وہ مکتب میں نہیں بیٹھا۔ کسی استاد سے اس نے سبق نہیں لیا تاہم ہمارے نزدیک (اور ہمارے نزدیک کیا بلکہ واقع میں) ایک اعتبار سے اس کی تعلیم و تربیت بہت کچھ ہو چکی تھی۔ دنیا میں سارے لوگ پڑھے لکھے نہیں ہوتے اور پڑھنے لکھنے پر زندگی یا معاش کا انحصار ہے اصل چیز ہے عادت کی درستی، مزاج کی شناسائی، طبیعت کی اصلاح، سو جس وقت سے بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی وقت سے وہ اخذ کر چلتا ہے۔ ان لوگوں کی خوبو جو اس کو پالتے۔ اس کو اٹھاتے بٹھاتے۔ اس کو سلاتے۔ اس کو کھلاتے پلاتے ہیں۔ ظاہر میں معلوم ہوتا ہے کہ بچے ایک مفغہ گوشت کی طرح پڑے ہیں۔ نادان اور ابلہ عقل نہیں۔ وہ اپنے سارے حواس سے ظاہری ہوں یا باطنی بڑی کوشش کے ساتھ کام لے رہے ہیں۔ چیزوں کو دیکھتے ٹٹولتے آوازوں کو سنتے اور جو دیکھتے سنتے اس کو حافظے میں رکھتے جاتے ہیں۔ اس کی ایک آسان شناخت ہے کہ اگر بڑی عمر میں ہم کوئی دوسری زبان سیکھنی چاہیں تو کس قدر کوشش کرنی ہوتی ہے۔ بعض بعض اوقات سارے سارے دن رٹنا پڑتا ہے اور ہم کو اپنی مادری زبان سے لکھنا آتا ہے تو لکھنے سے اس زبان کی صرف ونحو سے لغت سے بھی بڑی مدد ملتی رہتی ہے۔ تب ہم کو کہیں برسوں میں جا کر وہ زبان آتی ہے۔ تاہم ناقص و نامتھام بچے جن کو ہماری سہولتوں میں کوئی سہولت بھی حاصل نہیں کیا کچھ زحمت اٹھاتے ہوں گے کہ ذہین ہوئے تو برس کے اندر ہی اندر وہ نہ ڈھائی تین برس کی عمر میں تو مٹھے لدھڑ کند ذہن تک طوطے کی طرح چہرے لگتے ہیں۔ کیا اتنی بات سے کہ کسی نے ہیامما اور اما۔ دس بیس بار سکھانے کے طور پر ان کے سامنے کہہ دیا۔ کوئی دعویٰ کر سکتا ہے کہ ہم نے ان کو بولنا سکھایا، زبان کی تعلیم کی نہیں یہ سب بچوں کی ذاتی کوشش ہے۔ پھر یہ خیال کرنا بھی غلط ہے کہ بچوں کی ساری ہمت صرف زبان

کے سیکھنے میں مصروف رہتی ہے، ایک زبان کیا بھلا برا، ادب قاعدہ، نشت و برخاست، رغبت اور نفرت، سودوزیاں، دوست دشمن، خویش و بیگانہ۔ محبت اور عداوت حیا اور غیرت، غصہ اور اُلج۔ حسد اور رشک وغیرہ وغیرہ سارے سبق ان کو ایک ساتھ شروع کر دیئے جاتے ہیں۔ پس بتانا جس کی عمر آٹھ برس ہو چکی تھی، پڑھ چکا تھا۔ جو کچھ اس کو پڑھنا تھا۔ وہ پڑھ چکا تھا۔ جو کچھ اس کو سیکھنا تھا۔ ماں سے، باپ سے، مانی سے، خالہ سے، بہنوں سے، گھر کے نوکروں سے، آئے گئے سے، عمر کے اعتبار سے اس کی تعلیم و تربیت کی ایسی مثال تھی کہ جیسے کپڑا مول لیا گیا۔ درزی نے قطع کیا۔ سیا اور کھڑا کرنے کے بعد اس نے پہنا کر بھی دیکھ لیا۔ صرف بخیرہ کر دینا باقی ہے۔ اب اگر کپڑا بد رنگ یا گا ہوا نکلے یا کہیں سے تنگ ہو جائے تو درزی اس میں کیا کمال کرے گا۔ کپڑا لیتے وقت یا قطع کراتے وقت یہ باتیں دیکھنے کی تھیں اور نہیں دیکھیں تو جبک مارو اور وہی پہنو گا ہوا کہ پہنا اور کھڑکا کچے رنگ کا جس میں پہلے ہی دن دھبے نمودار ہوں۔ یہاں تک کہ پہلے سے بدن میں بدھیاں پڑھیں اور سانس اندر کا اندر اور باہر کا باہر رہ جائے۔ اب دیکھنا چاہیے کہ بتانا پر زمان خانے کی تعلیم کا کیا اثر مرتب ہوا تھا۔ جوں جوں وہ بڑا ہوتا گیا۔ ضدی، چڑچڑا، غصیلا، مچالا، ہیلیا، زودرنج، مغرور، خود پسند، طماع، حریص، تنگ چشم، بودا، ڈرپوک، شوخ، شریر، بے ادب، گستاخ، کابل، آرام طلب، جابر، سخت گیر، گھر گھسنا، زمانہ مزاج بنتا گیا۔ اس کو دنیا و مافیہا کی کچھ خبر تو تھی نہیں، کبھی وہ بے رت کے پھلوں اور بے موسم کے میوؤں کے لیے گھنٹوں لوٹتا اور پٹنیاں کھاتا بہروں ایڑیاں رگڑتا اور آخر کواڑیوں کے بدلے اپنے چاہنے والوں اور ناز برداروں سے تاک رگڑا لیتا تب بہ مشکل چپ کرتا۔ وہ جب جی چاہتا جو چیز چاہتا جتنی چاہتا کھاتا اور اپنی بے استدالیوں اور بے احتیاطیوں سے بیمار پڑتا، اور التا ماں سے لڑتا۔ ایک مرتبہ وہ اس بات پر خوب رویا اور بہت کھرا کہ ہائے بادل کیوں گرت رہا ہے۔ ہر چند سارا گھر اس بات کے اہتمام میں لگا رہتا تھا کہ کوئی امر اس کے خلاف مزاج نہ ہو۔ مگر اس کے رونے اور بگڑنے کے لیے ہر وقت کوئی نہ کوئی بہانہ ایک نہ ایک حیل مل ہی جاتا تھا۔ اس کی ناخوشی کا روکنا حقیقت میں انسان کے اختیار میں خارت اور آدمی کی قدرت سے باہر تھا۔ کوئی جان نہیں سکتا تھا کہ وہ کس بات پر روٹھ جائے گا۔ اور رُوٹھے پیچھے کسی کو خبر نہ تھی کہ وہ کیونکر منے گا۔ لاکھ اللہ آمین کیوں نہ ہو، کہاں تک برداشت کتنا خم، آخر رفتہ رفتہ لوگ اس کے لاڈ پیار میں کمی کرنے لگے۔ سب سے پہلے بڑی اور بیاہی ہوئی صاحب اولاد بہنوں نے بے رخی ظاہر کی۔ آخر تھیں تو اس کی بہنیں جب اس کی شوخی و شرارت سے عاجز آتیں جھڑک دیتیں اور گھرک میٹھتیں بلکہ ایک تو ایسی جلتی تھی کہ یہ اس کے پاس بھانجے کو دق کرنے اور بوٹیاں توڑنے گیا اور اس نے دور ہی سے ڈانٹا کہ خبردار جو میرے بچے کو جھیڑا ہو گا۔ میں ایسے چو نچلے ایک نہیں سمجھتی۔ دیکھو خدا کی قسم میں مار بیٹھوں گی۔ ماں کا بھی بتانا کہ ہاتھوں دم تاک میں تھا۔ مگر سچ کہا ہے حبک العشی بعمی و

بسمعہ ۶۔ وہ کھسیانی تو ہوتی تھی مگر ادھر جوش آیا اور نو رائٹھنڈی پڑ گئی۔ تیوری پر پل پڑ چا تھا کہ کھلکا کر ہنس دی۔ بتلا کی برائیوں کو برائی سمجھنا تو درکنار وہ اس کی طرف سے ساری دنیا کے ساتھ ہر وقت لڑنے کو تیار تھی۔ ایک مرتبہ بتلا خدا جانے کس بات پر پیچھے سے ماں کی چوٹی گھسیٹے جاتا تھا۔ سب سے بڑی بہن نے (جس کی پہلوئی بیٹی بتلا سے بھی دو برس بڑی تھی) دیکھ کر سبحان اللہ کیا ماں کا وقرب۔ لاڈ پیار بہت دیکھے مگر اتنا ہموار اس درجے بے تمیز جب ماں کا یہ بدڑا کر رکھا ہے۔ تو ہمارا تو سرموئڈ کر بھی بس نہیں کرے گا۔ ہائے تو میرا بیٹا نہ ہوا تجھ کو ایسا ٹھیک بناتی کہ یاد ہی تو کرتا۔ باوجودیکہ بیٹی نے نصیحت کی بات کہی تھی مگر ماں نے بچہ جھاڑ کر اس کے پیچھے لپٹی اور سر ہو گئی۔ ماں کی پردہ داری کی وجہ سے باپ کو بتلا کی شونیوں کی پوری پوری خبر نہیں ہونے پائی تھی پھر بھی جس قدر حال چارو ناچار معلوم تھا اس سے انہوں نے اتنا تو سمجھ لیا تھا کہ اس کا اٹھان اچھا نہیں۔ بتلا کو چھٹا سال لگا تھا۔ باپ نے اس کو کتب میں بٹھانا چاہا۔ عورتوں نے عذر کیا کہ آئے دن تو یہ بیمار رہتا ہے۔ مکتب کی قید، استاد کی تنبیہ سے اس کا گلوڑ اتنا ساجی رہا سہا اور بھی اداس ہو جائے گا۔ ابھی جینے دو اور بتلا کی ماں نے تو کھلا کھلا کر کہہ دیا کہ جب تک اصل خیر سے ان گنا نہ گزر جائے میں تو اس کو نہ لکھاؤں نہ پڑھاؤں غرض عورتوں کی ہٹ اور نیکی نے بتلا کے پورے تین برس کھوئے مگر سچی بات یہ ہے کہ بتلا کا باپ اپنی طرف سے برابر اس کی کوششوں میں لگا رہا۔ اس پر بھی جو بتلا تین برس تک آوارہ ہوتا رہا تو یہ اس کے باپ کا مسالہ اور ضعف۔ ماں کی نادانی اور حماقت اور خود بتلا کی بد قسمتی اور کم بختی۔ اتنا تھا کہ جب باپ کو بتلا کی کوئی بے جا بات معلوم ہوتی تو اسے ڈراتے دھمکاتے تو نہیں مگر نرمی اور دل جوئی کے ساتھ اس کو سمجھا ضرور دیتے کہ بیٹا یہ حرکت بہت نامناسب ہے اور خود اس کے ساتھ ظاہری پیارا خلاص اتنا نہ رکھتے کہ ماں کی چوٹی کے ساتھ ان کی ڈاڑھی بھی کھسوٹنے لگتا۔ بتلا کو باپ کا کسی طرح کا خوف تو نہ تھا۔ مگر یوں کہو کہ زیادہ میل جول نہ ہونے کی وجہ سے ایک طور کی جھجک اور رکاوٹ تھی۔ چاہو اس کو لحاظ سے تعبیر کرو۔ مگر کیا اتنا کرنے سے بتلا کے باپ نے باپ ہونے کا فرض ادا کیا۔ ہرگز ہرگز نہیں۔ اس نے عورتوں کو بتلا کی شرائط کی پردہ داری کرنے دی۔ اس نے بیٹے کے حالات سے پوری پوری خبر نہ رکھی۔ اس نے جتنی خبر رکھی اس کا بھی تدارک جیسا چاہیے تھا نہ کیا۔ اس نے مستورات ناقصات القتل کی رائے میں آکر جلد سے جلد بیٹے کو پڑھنے کے لیے نہ بٹھایا اور اس کے اکٹھے تین برس ضائع ہونے دیئے۔ اتنا غنیمت ہوا کہ بتلا کو اس کی ماں نے اپنے وہم کو پیچھے کیا اور کیا! گھر سے باہر نہیں نکلنے دیا ورنہ محلے میں دھوبی کنجڑے، بٹھیارے، قصائی، تیلی اس قسم کے لوگ بھی رہتے تھے۔ اگر کہیں بتلا ان لوگوں کے لڑکوں میں کھیلنے کو نہ پاتا تو ساری خوبیاں جا کر ایک ذاتی شرافت باقی تھی وہ بھی گئی گزری ہوتی۔ جب تک بیٹھا برس ختم ہوا، بتلا کے مزاج کی تلخی اضاعاً اعضا بڑھ گئی تھی۔ ادھر ابھی سالگرہ کو دو تین مہینے باقی تھے کہ باپ نے بسم

اللہ اور مکتب کی چھیڑ چھاڑ شروع کی، بارے اس مرتبہ عورتوں نے بھی چنداں مزاحمت نہیں کی اور سالگرہ اور بسم اللہ دونوں تقریبیں ایک ساتھ ہو گئیں۔



## بتا کی تعلیم مکتبی اور اس کا اثر

انتا تو ہوا کہ بتا کے لیے دروازے پر مکتب بٹھانا پڑا۔ شروع شروع میں تو میاں جی کے پاس تک جانے اور مکتب میں بیٹھنے کے لیے بتا نے خوب خوب فیل مچائے اور غضب بکھرا مگر آخر سودے کی چاٹ اور پیسوں کے لالچ اور ماں کے چکار نے پچکار نے سے جانے اور بیٹھنے تو لگا۔ بیٹھے پیچھے پڑھنا چنداں مشکل نہ تھا۔ ذہن اور حافظہ دونوں خدا داد اس باا کے تھے کہ جو دوسرے لڑکے ہفتوں میں کرتے تھے وہ بھی بڑی ریں ریں کے ساتھ بتا گھنٹوں میں کھیلے کودتے، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، کھڑے کھڑے، کھتے ہیں کہ دو دن میں تو اس نے الف بے کے حروف منفرد ایسی اچھی طرح پہچان لیے تھے کہ کتابوں میں سے آپ ڈھونڈ ڈھونڈ کر بتاتا۔ پڑھنا تھا کہ اس کے ساتھ داد واد شاہباش شروع ہوئی۔ اس کے دل کی امنگ بڑھتی چلی اور ہر وا کھلتا گیا۔ بتا نہ مطالعہ دیکھتا نہ سبق یاد کرتا۔ نہ آموختہ پڑھتا۔ مگر ایک ہی دفعہ کے دیکھ لینے سے وہ سب ہم سبقوں میں میر ہی رہتا تھا۔ بدشونخی اور شونخی اور شرارت کی نسبت جو چاہو سو کہو۔ پڑھنے لکھنے کے متعلق تو میاں جی کو اس کی شکایت کرنے کا موقع نہ ملا۔ پر لے سرے کی بے توجہی اور حد درجے کی بدشونخی پر چھ برس میں اس کی فارسی کی استعداد ایسی ہو گئی تھی کہ مکتب کے لڑکے تو کیا خود میاں جی باوجود یکہ اچھے جید فارسی دان تھے اور درسی کتابیں بھی ان کو خوب متحضر تھیں، اس کو سبق دیتے ہوئے بھناتے تھے۔ بتا کو مکتب کی تعلیم نے اتنا فائدہ تو پہنچایا کہ اس کو ایک دوسرے ملک کی زبان جس کے بدون اردو کی تکمیل نہیں ہو سکتی، اچھی خاصی آگئی مگر اس کی تعلیم سے اس کو ایک بہت بڑا نقصان بھی پہنچا جس کو اندر باہر کسی نے جانا پہچانا نہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ بتا کو اپنا حسین ہونا کب سے معلوم ہوا۔ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ اس خاندان میں شکل و صورت کی بڑی پرچول رہتی تھی۔ اس خاندان کی عورتوں کے نزدیک تو دنیا بھر کے ہنر، سلیقے، حسب نسب، دولت، تندرستی، نیک مزاجی، صاحب اولاد ہونا، دینداری، ساری نعمتیں اور برکتیں ایک طرف اور گورارنگ اور نقشہ ایک طرف۔ صورت شکل تو انسان کے اختیار کی بات نہیں۔ خدا جس کو جیسا چاہتا ہے بناتا ہے ایک ہی ماں کے پیٹ سے دس بچے ہوتے ہیں اور کیا خدا کی قدرت ہے کہ دس کی دس شکلیں مختلف، ورنہ ایک دوسرے سے ملتوس ہو کر کوئی پہچان نہ پڑے، انسان کے چہرے کی بساط کیا، اتنی ہی سی جگہ میں ہزاروں اکھوں کروڑوں مختلف نقشے یہ سب اس کی قدرت کی دلیلیں ہیں۔ آدمی اتنا سمجھے تو اپنے چہرے مہرے پر نہ ناز کرے نہ دوسرے پر ہنسے مگر بتا کے خاندان کو ایسے خیالات سے کیا واسطہ، یہاں تو جھوٹے بڑے، بڈھے، جوان، بیاب کنوارے سب کی صورت شکل کا پٹنا تھا۔ آپس ہی میں اسی

صورتِ شکل کے پیچھے ایک کی ایک سے نہیں بنتی تھی۔ ایک ایک کو چھاتی۔ ایک ایک کی نقلیں کرتی اور اتفاق سے کنبے میں کوئی اقرب ہوتی اور یہ لوگ مہمان جاتے یا کہیں شامت کی ماری کسی نئی دہن کو دیکھ آتے تو بس مہینوں ان کو صورتوں کا جھگڑا لگا رہتا۔ یہاں تک کہ ان عورتوں کی ایسی عادتیں دیکھ کر لوگ ان سے ملنے میں مضائقہ کرنے لگے تھے۔ بتانا کا ایسے خاندان میں پیدا ہونا اور پرورش پانا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ جب اس کو بات کے سمجھنے کا شعور ہوا تو شاید سب سے پہلی بات جو اس نے سمجھی یہی ہوگی کہ حسن صورت اس کو کہتے ہیں اور اس میں مصداق لبوں مگر جب تک بتانا زنان خانے کی نگرانی میں رہا اس کی عمر ہی کیا تھی۔ سات آٹھ برس اس وقت تک وہ اتنا ہی سمجھ سکتا تھا کہ ٹیٹھی چیز سب کو بھاتی ہے۔ اور چونکہ وہ اپنے ذائقے میں بھی اس کی لذت پاتا تھا۔ اس نے سمجھا تھا کہ حقیقت میں بھانے کی چیز ہے۔ آگ کے چھوتے ہوئے لوگ ڈرتے ہیں اور اس نے بھی شاید دو چار بار اس سے چہکا کھایا ہو۔ اس کو معلوم تھا کہ آگ سے جل جاتے ہیں۔ غرض جس چیز کی نسبت لوگوں کو کہتے سنا کہ اچھی یا بری ہے۔ آپ بھی تجربہ کیا تو ثابت ہوا کہ جس چیز سے آرام پہنچے دل کو خوشی ہو، اچھی ہے۔ اور جس سے ایذا پہنچے تکلیف ہو بری۔ حسن کی خوبی کی نسبت اس کو ایسا یقین کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ کیونکہ اس کو حسن سے متلذذ ہونے کی اس وقت تک اہلیت ہی نہ تھی۔ مکتب میں بیٹھنے کے بھی ایک مدت بعد اس میں جوانی کے ولولوں کی تحریک شروع ہوئی اور جوں جوں یہ تحریک قوت اور استبداد پکڑتی گئی۔ اس پر پسندیدگی حسن کی وجہ سے منکشف ہوتی گئی۔ اس کا تذکرہ گھر میں تھا۔ اور اسی کا سبق مکتب میں اور اب لگا اندر سے دل بھی اس کی گواہی دینے، بتانا نے جو زبان فارسی کے سیکھنے میں غیر معمولی ترقی کی، اس کا بھی سبب یہی تھا کہ اکثر کتابیں نظم جن کو بتانا کی شکل صورت کا آدمی بے مزامیر ذرائع سے پڑھے تو اچھے خاصے ثقہ مجرے کا مزاملے۔ مضمون دیکھو تو جھڑا عاشقی جس کے نام سے نو عمر آدمی کے منہ میں رال بھر آئے۔ مادہ قابل طبیعت مناسب۔ بتانا کا تو حال یہ تھا کہ جو شعر عاشقانہ ایک بار بھی اس کی نظر سے گزرا۔ دیکھنے کے ساتھ ہی کانتش فی الجبر ہو گیا۔ غرض فیضان مکتب سے حضرت میں ایک صفت اور پیدا ہوئی یعنی عاشق مزاجی۔

## بتالا کا مدرسے میں تعلیم پانا اور برے لڑکوں کی صحبت میں آوارہ ہونا

بتالا کے باپ کی تو پہلے ہی سے یہ رائے تھی کہ اس کو شروع سے مدرسے میں بٹھایا جائے مگر عورتوں کو بتالا کی اتنی مفارقت بھی گوارا نہ ہوئی۔ تا چارپورے چھ برس میاں جی کو نوکر رکھ کر اس کو گھر ہی پر تعلیم دلوائی اب میاں جی کا بھی سرمایہ معلومات ختم ہو چکنے پر آیا اور فارسی کی درسی متداول کتابیں سب بتالا کی نظر سے نکل گئیں۔ اور بات صاف تو یہ بن کہ بتالا کے سر میں اب اور ہوا بھری ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں ڈھونڈتی تھیں یا روں کے جلسے دوستوں کی صحبتیں اور وہ گھر پر میسر نہ تھیں۔ باپ نے کچھ اور سوچا بتالا نے کچھ اور۔ غرض سب کی صلاح سے بتالا مدرسے میں داخل ہوا۔ تو بتالا نے چھ برس مکتب میں تعلیم پائی مگر مکتب کیا تھا برائے نام۔ اس کا جی بہلنے کے لیے چارپانچ ریزنگی لڑکے اور بٹھا لیے گئے تھے، یعنی جسمائے بے چودہ برس کی عمر تک بتالا بھونرے میں پلا۔ اور دنیا کی کسی قسم کی ہوا اس کو نہ لگنے پائی۔ اب جو مدرسے کی عربی جماعت میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا: لڑکوں کا جنگل کہ سات سات آٹھ آٹھ برس کی عمر سے لے کر بیس پچیس برس تک اچھے خاصے جوان ہر ذات کے ہر پیشے کے چار ساڑھے چار سو لڑکے ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔ اگرچہ انگریزی، عربی، فارسی، منسکرت، ریاضی کی جماعتیں علیحدہ علیحدہ ہیں اور ہر جماعت کا کمرہ الگ مگر اوقات درس کے علاوہ سب ایک دوسرے سے بلا امتیاز آنا دانا ملتے بات چیت کرتے اور کھیلتے ہیں۔ بتالا کو یہ حال دیکھ کر بلا مبالغہ ایسی خوشی ہوئی جیسے کسی جانور کو قفس سے آزاد کر کے بانٹ میں چھوڑ دیا جائے۔ اب تک وہ یہی جانتا تھا کہ میاں جی ہوئے، مولوی ہوئے، بڈھے ہی ہوتے ہوں گے۔ کیونکہ اس نے اپنے میاں جی کو دیکھا تھا پکیں تک سفید، یہاں مدرسے میں آکر دیکھا مدرس اکثر جوان کہ اب سے چار چارپانچ برس پہلے خود طالب علم تھے۔ امتحان دیا۔ پاس ہوئے زمرہ مدرسین میں داخل کر لیے گئے۔ اس کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ بعض مدرس اپنی جماعت کے بعض بعض طالب علموں سے بھی کم سن ہیں۔ جس جماعت میں بتالا داخل ہوا، چونکہ عربی کی سب سے چھوٹی جماعت تھی۔ اس میں طالب علموں کی بڑی کثرت تھی۔ رجسٹر میں تو ستر لڑکوں کا نام تھا مگر پچاس پچپن ہمیشہ حاضر رہتے تھے ایک میں سے ایک تہائی کے قریب بتالا سے بہت بڑی عمر کے تھے۔ اس جماعت کو جو مولوی صاحب پڑھاتے تھے جیسے ان کی جماعت سب جماعتوں میں چھوٹی تھی ویسے ہی تمام مدرسوں میں خود بھی سب سے چھوٹے تھے۔ عمر میں قد و قامت میں وقعت و جاہت میں یعنی قسمت سے مدرس بھی ملے تو یا راستہ ڈانڈا تھا، نکملا اور

طرح دار مدرسے کے احاطے میں پاؤں کا دھرتا تھا کہ یاروں نے بتایا کہ ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بعض تو ٹکٹکی باندھ باندھ کراہی بری طرح گھورتے تھے کہ گویا آنکھوں کے رستے کھائے جاتے ہیں۔ پہلے ہی سے لڑکوں میں بہت سی ٹولیاں تھیں۔ اب ایک بڑی بھاری اور نئی ٹولی بتایا کی قائم ہوئی۔ ایک جماعت بندی تو سرکاری تھی کہ جس قدر لڑکے ہم سبق ہوتے سب کے سب وقت واحد میں ایک استاد سے پڑھتے۔ مگر ایک جماعت بندی لڑکوں نے آپس میں ٹھہرا رکھی تھی جس کو ہم نے ٹولی سے تعبیر کیا۔ جس طرح سرکاری جماعت بندی کے اوقات مقرر تھے کہ مثلاً جب ریاضی کا گھنٹا آیا۔ عربی اور فارسی اور منسکرت کی جماعتوں سے جو جو ریاضی کا پڑھنے والا تھا۔ ماسٹر صاحب کی خدمت میں آ حاضر ہوا۔ اسی طرح ٹولیوں کے اجتماع کے بھی خاص خاص اوقات تھے۔ مدرسے کے وقت سے ذرا پہلے لڑکے سویرے مدرسے میں آ پہنچتے یا جب ایک بجے نماز کے لیے ایک گھنٹے کی چھٹی ہوتی یا مدرسہ برخواست ہونے کے بعد ان تین وقتوں میں جو لڑکا جس ٹولی کا تھا اس میں آ ملتا اور بعض چھٹیں بھی پڑے پھرتے تھے جو کسی ٹولی میں نہ تھے۔ یہ ٹولیاں ایک مجمع تاجانز تھیں اور ان کی اغراض مشترکہ تمام تر بے ہودہ مدرسے کے سارے انتظام اچھے تھے۔ چیزیں ود پڑھاتے تھے جو دنیا میں بکار آمد ہوں شوق کے مشتمل کرنے کو امتحان کا قاعدہ نہایت عمدہ تھا۔ فرداً فرداً ایک ایک لڑکے کو الگ الگ سبق پڑھانے سے جماعت کو پڑھانے کا نہایت مفید طریقہ تھا۔ اس سے لڑکوں میں ایک طرح کی مناقشت پیدا ہوتی تھی کہ ایک پر ایک سبقت لے جانی چاہتا تھا۔ دوسرے ہم سبق ہونے سے ایک، ایک کی مدد کر سکتا تھا۔ تیسرے لڑکوں کی لیاقت کا موازنہ اور مقابلہ بخوبی ہو سکتا تھا۔ لڑکوں کو حاضر باشی کا پابند کرنے کے لیے ترتیب، نشست کار دو بدل بھی بہت موثر تھا۔ پڑھائی اس قدر تھی کہ لڑکوں کو تمام وقت مشغول رکھنے کے لیے بخوبی کافی تھی۔ نوبت بہ نوبت مختلف مضامین کے پڑھانے سے طبیعت لمول اور کند نہیں ہونے پاتی تھی۔ غرض سبھی انتظام بھلے تھے، مگر افسوس لڑکوں کے چال چلن اور اخلاق کی طرف کسی کو مطلق توجہ نہ تھی۔ ہر مدرس اس فکر میں رہتا کہ جس چیز کا پڑھانا اس سے متعلق ہے۔ اس چیز کے امتحان میں لڑکے برے نہ ہیں۔ جب تک کوئی لڑکا اس شرط کو پورا کیے جاتا ہے۔ اگرچہ چوری چھپے تاجانز طور پر دوسرے سے مدد لے کر ہی کیوں نہ ہو کسی کو اس کے کردار سے بحث نہیں، چوری کرو، جھوٹ بولو، سر بازار جوتی پیزا لڑاو، گالیاں کھاؤ، شرافت کو ہٹا لگاؤ، بد معاشوں میں رہو اور بد معاش بنو۔ کیڑیاں کھیلو پتنگ لڑاو۔ اکھاڑے میں جا کر ڈانٹر پیلو۔ مگر بلاؤ۔ گاؤ بجائو غرض جو تمہارا جی چاہے سو کرو مگر جو چیزیں پڑھائی جاتی ہیں ان میں امتحان اچھا دو تو سکا لرشپ بھی ہے۔ انعام بھی، سرخروئی بھی ہے، آفریں اور تحسین بھی ہے واداد بھی ہے۔ اور آخر کار نوکری بھی ہے۔ مدرس خوش۔ پرنسپل صاحب راضی، بتایا کی افتادہ روز پیدائش سے بگڑی ہوئی تھی۔ زنان خانے میں پرورش پاتا تھا کہ اس کے دل میں بدی کا بیج بویا گیا۔ مکتب میں تھا کہ بیج کا

درخت ہوا، اب مدرسے میں آکر وہ درخت پھلا پھولا۔ گھر میں بچھڑا تھا۔ مکتب میں بچھڑے کا نیل ہوا اور مدرسے میں نیل کا ساہنڈ۔ کسی قسم کی آوارگی نہ تھی جو اس سے بچی ہو اور کسی طرح کی بیہودگی نہ تھی جو اس نے نہ کی ہو۔ جس طرح بتانا مدرسے کے بڑے لڑکوں کی صحبت میں بانکا بنا۔ چھیلا بنا۔ طرح دار بنا۔ مسخرہ بنا۔ کوچہ دار بنا۔ ننگ خاندان بنا اور کیا کیا بنا۔ اسی طرح بتانا تخلص رکھ کر شاعر بنا، نصیحتیں تو رفتہ رفتہ بھولی بسری ہو گئیں۔ شاعری کی یادگار اس کا منحوس تخلص رہ گیا ہم کو تو اس کے نام سے اس قدر زفرت ہو گئی ہے کہ اس کے حالات کا دریافت کرنا کیسا سننے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ مگر خیر منہ پر بات آئی رک نہیں سکتی۔ آٹھ برس یہ کم بخت مدرسے میں رہا۔ آخر کچھ نہ کچھ پڑھتا ہو گا کہ عربی کی دوسری جماعت تک اس نے ترقی کی۔ دس روپے مہینہ وظیفہ پاتا تھا۔ برس کے برس انعام بھی ملتے رہتے تھے۔ ایک سال سنا کہ ایسا اچھا امتحان دیا، تمغہ ملا۔ یہ کچھ تعجب کی بات نہیں اور نہ اس سے آوارگی کا الزام رفع ہو سکتا ہے۔ ہم کو اس کی ذکاوت کا حال معلوم ہے وہ اس بلا کا ذہین تھا کہ مدرسے کی پڑھائی اس کے آگے کچھ حقیقت ہی نہ رکھتی تھی۔ برس میں ایک بار تو امتحان ہوتا تھا۔ اکثر انگریزوں کے بڑے دن سے پہلے پس امتحان کے مہینے ڈیڑھ مہینے آگے سے وہ تیاری کر لیتا ہو گا۔ لیکن فرض کیا کہ وہ اچھی طرح پڑھتا ہی ہے تو بد وضع کو پڑھنے سے فائدہ، علم سے حاصل۔ اس سے جاہل بہ مدارج ان پڑھ کہیں بھلا۔ مدرسے پھر سواپہر رات گئے بلکہ کبھی آدھی کبھی پچھلی رات کو تو اس کا گھر میں آنے کا معمول شروع سے تھا۔ اور پھر اچھی طرح سو رچ نکلا کہ اس کے شیاطین انس ملے لگے گھر پر آکر کنڈی کھٹکھٹانے، دستک دینے اور پکارنے، سیٹی بجانے، اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ تین تین چار چار دن تک برابر غائب، ماں کو یہ تمام تفصیلی حالات معلوم تھے۔ مگر اب اس کی محبت کا دوسرا رنگ تھا۔ بیٹے سے اس قدر ڈرتی تھی جیسے قصائی سے گائے۔ اس کو آپ سے آپ یہ خوف سا گیا تھا کہ بیٹا بے ماشاء اللہ جوان ایسا نہ ہو میری بات کا برا مان کر کہیں کو نکل جائے۔ یا اپنے تین بلاک کرے تو پھر میں کدھر کی ہوئی۔ اس ڈر کے مارے بے چاری کبھی چوں نہیں کرتی تھی اور بتانا نے اپنے تین اس کے نزدیک ایسا ہوا بنا رکھا تھا کہ جب اس کی صورت دیکھتی ہکا بکا ہو کر رد جاتی۔ پہلے سے بھی بتانا کی شرارتوں کی باپ سے پردہ داری کی جاتی تھی۔ اب انہیں شرارتوں کی بدکرداریاں ہو گئی تھیں۔ ادھر شرارتوں میں ترقی ہوئی، ادھر پردہ داری میں زیادہ اہتمام ہونے لگا۔ مگر باپ نے دھوپ میں داڑھی سفید نہیں کی تھی۔ بڑھا اس کی چال ڈھال سے اس کی گفتگو سے اس کی کن اکھیوں سے تاڑ لیتا تھا۔ مگر بی بی کا غلوب تھا اور خوب جانتا تھا کہ اس کو بیٹے کے ساتھ بلا کا شغف ہے اور یوں بھی ہر کام میں مسابقت کرنا اس کی ہمیشہ کی عادت تھی اور انہیں وجود سے اس نے بتانا کی اصلاح کی طرف کبھی پوری توجہ نہ کی۔ اب جوان بیٹے کے کیا منہ لگتا۔ ایک کہتا تو دس سنتا۔ آخر اس کے سوائے اور کچھ نہ سوجھ پڑی کہ جس قدر جلد ممکن ہو اس کو پابند کر دیا جائے۔

## بتلا کا بیاہ اور اس کا معاملہ بی بی کے ساتھ

یہ کب کی بات ہے کہ بتلا کو مدر سے میں داخل ہوئے چوتھا برس شروع تھا۔ خوشحال باپ کا بیٹا صورت شکل کا اچھا بلکہ حد سے زیادہ اچھا پڑھا لکھا کماؤ۔ دس روپے کا مدر سے میں وظیفہ دار اس رو داد کے لڑکے کو بیٹیوں کی کیا کمی تھی۔ قاعدے کے مطابق بتلا کی طرف سے بیٹی والوں کے یہاں ابتداً رقعہ جانا چاہیے تھا۔ مگر بتلا کی ظاہری حالت دیکھ سن کر لوگ اس قدر رنجھے ہوئے تھے کہ کئی جگہ سے بیٹی والوں نے منہ پھوڑ کر رقعہ منگوا بھیجا۔ دستور کی بات ہے کہ خریداروں کی کثرت ہوتی ہے تو بیچنے والوں کے مغز چل جاتے ہیں۔ بتلا کی ماں بہنوں کا یہ حال تھا کہ کہیں کی بات ان کے خاطر تلے آتی ہی نہ تھی ورنہ کیا بتلا جیسا اللہ آمین کا بیٹا سترہ اٹھارہ برس کی عمر تک کنوارا بیٹھتا۔ اب تک تو اس کے ایک چھوڑکھی کے چار چار بیاہ ہو گئے ہوتے۔ اس گھر کی خوشحالی اتنی ہی تھی کہ قلعے کی تنخواہیں، اسمایاں مکانات کا کرایہ ملا کر کل سو سو سو روپے کی آمدنی تھی اور اس میں اتنا بڑا کنبہ مگرو دو بتلا کا باپ ایسا منظم اور کفایت شعار آدمی تھا کہ اس نے اپنے سلیقے سے گھر کا بھرم بنا رکھا تھا۔ اس حالت پر جہاں کہیں سے پیام آیا چھوٹے کے ساتھ ایک دم سے چاندی کا بھی نہیں سونے کے پلنگ کی فرمائش ایسے اصرار کے ساتھ ہوتی تھی۔ گویا کہ نکاح کی شرط اعظم ہے اور پھر معاملے کی بات ہے جیسا لینا ویسا دینا۔ ہیکڑی تو یہ تھی کہ لیں تو سنہرا پلنگ اور دینے کے نام پٹاری کے خرچ کے لیے آدھی نہیں کیونکہ ہمارے خاندان کا دستور نہیں۔ مہر شرع محمدی، سو روپے کا چڑھاوا، سو روپے کا جھومر، صورت شکل اپنی اپنی جگہ سبھی تلاش کرتے ہیں۔ اور سمجھنے اور غور کرنے والے کو تو یہ بات ہے کہ باوجودیکہ ہر شخص خوبصورتی کا خواہاں ہے مگر بری بھلی، کالی گوری یہاں تک کہ کانڑی، کھدري اللہ کی بندیاں سبھی کبھی چلی جاتی ہیں، ہم نے تو اتنی عمر ہونے آئی کسی کو صورت کی وجہ سے کنواری بیٹھے نہ دیکھا۔ تاہم چونکہ بتلا ایک خوبصورت خاندان کا آدمی اور خود بھی بڑا خوبصورت تھا۔ اگر اس کے لیے خوبصورت بی بی تلاش کی جاتی تھی تو کچھ بے جا بات نہ تھی۔ مگر تلاش کرنے کے بھی طریقے ہوتے ہیں کہ عورتیں چوری چھپے حیلے بہانے کسی نہ کسی لڑکی کو یا تو خود کسی وقت دیکھ کر آتی ہیں یا اپنے دیکھنے کا موقع نہیں بنتا تو کسی کو بھیج کر دکھلوا لیا کرتی ہیں۔ یہاں تو یہ ضد کہ ہم تو اپنی آنکھ سے دیکھ بھال کر کریں گے اور اپنے ہاتھوں سے لڑکی کے منہ میں مصری کی ڈالی دیں گے۔ کیسی کیسی جگہ سے پیام آئے۔ کہاں کہاں رقعہ گیا مگر کہیں لین دین پر تکرار ہوئی۔ کہیں صورت پسند نہ آئی، کہیں دیکھنے بھانے کی شرط نامنظور ہوئی۔

غرض کوئی بات ٹھہری نہیں۔ پچاسوں پیام ستر داور بیسیوں جگہ سے رقعہ واپس۔ رشتہ ناتے کی بات چیت ہو کر جھٹم چھٹا ہو جانا رقعہ واپس آنا کچھ آسان نہیں ہے۔ بیٹی والے اس میں اپنی تنگ سمجھتے ہیں اور ان کو یہ خیال ہوتا ہے کہ ایک جگہ کا رقعہ واپس جائے گا تو دوسروں کو خدا جانے کیا کیا خیالات پیدا ہوں گے اکثر ایسے موقعوں پر داؤں میں رنجش آ جاتی ہے۔ خیر ایک دو جگہ بہ مجبوری ایسا اتفاق ہو تو مضائقہ نہیں نہ کہ بتانا کا رقعہ آج بھیجا اور بلا کر دس دن بعد الٹا منگوایا۔ جب متواتر واپسی رقعے کی نوبت پہنچی تو مارے شہر میں ایک نعل سا پڑ گیا اور جہاں جہاں رقعہ واپس منگوایا گیا۔ ان کے ساتھ بیٹھے بیٹھائے ایک طرح کی عداوت قائم ہوئی۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ جس مشاطہ سے کہتے کانوں پر ہاتھ دھرتی۔ جہاں رقعہ بھیجتے وہ لوگ لانے والے کے اندر آنے تک کے رد وادار نہ ہوتے۔ پس اس خاندان کے ناز بے جانے بتانا کو ایسا کوبنا دیا کہ اب کوئی اس کی بات کی حامی نہیں بھرتا تھا۔ رقعے کا بے رد و کد واپس آنا تو ممکن نہیں۔ ایک گھر کا تو ہم کو حال معلوم ہے کہ وہاں پہلے مشاطہ کی معرفت زبانی بات چیت ہوئی۔ وہ لوگ ان کے کنبے دار بلکہ کچھ دور کے رشتے دار بھی تھے۔ مہینوں سوال جواب ہوتے رہے۔ اکثر باتیں طے ہو کر بعض کی نسبت کچھ تکرار درپیش تھی۔ کہ یکا یک ان کی طرف سے رقعہ جامو جو دہوا۔ بیٹی والے خوش ہوئے کہ گفت و شنید کے بعد جو رقعہ آیا تو بس اس کے یہی معنی ہیں کہ منظور کر لیا۔ چنانچہ یہی سمجھ کر رقعہ تو رکھ لیا اور جواب میں زبانی اتنا ہی کہا! بھیجا کہ ہم کو بسرو چشم منظور ہے۔ خدا انجام اچھا کرے۔ انشاء اللہ دو چار دن میں صلاح کر کے کوئی اچھی سی تاریخ ٹھہرا کر کہا! بھیجیں گے۔ سہ ہنس آ کر لڑکی کا منہ بیٹھا کر جائیں۔ پھر اللہ خیر کرے۔ جب ان کی مرضی ہوگی بیاد برات ہو رہے گا۔ ہم تو اس وقت چاہیں تو اس وقت تیار ہیں۔ ہمارے یہاں ذرا دیر نہیں۔ جو عورت یہ پیام لے کر گئی تھی بتانا والوں نے اسی ہاتھ کہا! بھیجا کہ پہلے ہماری شرطوں کے مطابق تحریری اقرار نامہ بھیج دیں۔ تب تاریخ ٹھہرائیں۔ تاریخ کا ٹھہرانا ایسا کیا آسان ہے! یہ سن کر سب کو سخت تعجب ہوا اور اپنا سامنہ لے کر رو گئے۔ آخر بتانا والوں کی طرف سے واپسی رقعے کا تقاضا ہوا۔ دن میں دو بار رقعے کے لیے آدمی جاتا اور ایسی ایسی سخت سخت باتیں کہتا کہ گویا رقعہ کیا ہے مہاجن کا قرضہ ہے۔ خیر ہاں کہ رقعہ واپس تو کیا مگر اس طرح کے مارے غصے کے نکال کر موہری پر پھینک دیا کہ کم خواب کی تھیلی جس میں رقعہ دستور کے مطابق لپیٹ کر آیا تھا۔ تمام کچڑ میں لت پت ہو گئی اور کہا کہ جاؤ اس کو شہد لگا کر چاٹو اور دیکھو خبردار لڑکے کی ماں سے ضرور ضرور کہہ دینا کہ تم نے کنبے داری میں دو مہینے بات لگی رکھ کر آپ ہی رقعہ بھیجا اور پھر آپ ہی ان ہونی باتوں پر اصرار کر کے واپس منگوایا۔ یہ کچھ بھل مانسیت کی بات نہیں ہے۔ ہم نے مانا کہ ان کا بیٹا ان کے لیے چوہ کو ہلدی کی گرد اللہ آمین کا ہے۔ مگر دوسروں نے بیٹیاں کوڑے پر پڑی نہیں پائیں۔ ایسی شرطوں سے جو نہ سنیں نہ دیکھیں۔ ان کو شہر میں تو انشاء اللہ بیٹی ماننے کی نہیں۔ سونے کا پلنگ ان کو مانگتے ہوئے

شرم نہیں آتی۔ اس سے پہلے تین بیٹیاں بیاہ چکے ہیں اور ابھی اللہ رکھے آگے دو اور موجود ہیں۔ بیٹیوں کو تو ڈھنگ کے نواری پلنگ بھی نہ جڑے، بیٹے میں ایسا کیا سرخاب کا پر لگا بن کہ بدوں سونے کے پلنگ کے اس کو نیند نہیں آتی۔ اے وہ گلوڑا بیچو اتھا۔ جس کو سارا شہر تھڑی تھڑی کر رہا بن۔ خدا نہ کرے جو بھلا مانس اس کو بیٹی دے۔ منہ پر ہاتھ پھیر کر دیکھیں ناک رہی یا کٹ گئی جس گھر سے رفعت کی واپسی کا ندکور بن اس گھر کی عورتیں ایسی ملنسار تھیں کہ سارے شہر میں ان کا حصہ بخر اچلتا تھا۔ کہیں شادی بیاہ ہو۔ کوئی دوسری تقریب ہو۔ ان کے یہاں ضرور بلاوا آتا اور یہ بھی اپنے یہاں کی چھوٹی بڑی تقریب میں سبھی کو بلاتے۔ سبھی کو یکساں پوچھتے تھے۔ ان عورتوں نے خند میں آ کر بتانا کا اچھی طرح خاکہ اڑایا اور سارے شہر میں خوب ڈھونڈ واپٹا اور سوایا۔ غرض اس گھر کے بگاڑ نے رہی سہی اور بھی آس توڑ دی۔ اب شہر میں بتانا کی نسبت نانتے کا ہونا محال تھا۔ بہت قریب کے رشتہ داروں میں جس قدر بیٹیاں تھیں۔ بتانا تھے تو بڑے لاڈلے دودھ پی پی کر ان سب کو رضاعی بہنیں بنا چکے تھے۔ بتانا کے نزدیک و دور کے رشتہ داروں میں وہی مثل تھی۔ ازیں سوندا دوزاں سودر ماند۔ اب صرف ایک گھر رہ گیا کہ ہو تو وہیں ہو ورنہ بتانا ساری عمر کنوارا پھرے۔ بتانا کی پھوپھی دلی سے دس بارہ کوس سیدنگر میں بیاہی ہوئی تھیں۔ وداوگ زمیندار تھے مگر زمینداروں میں سربراہ و ردو بڑے بڑے سالم چھ گاؤں کے مالک ان کے بزرگ تو مہمان داری اور مسافر نوازی اور داد و دہش میں دور دور مشہور تھے۔ مگر اب کثرت پٹی داری کے سبب نہ ویسی آمدنی تھی نہ وددل۔ قرب شہر کی وجہ سے رعایا شوخ، حصہ داروں میں طرح طرح کی تکراریں غرض ہمیشہ ان میں دو چار آدمی مقدموں کی بیروی کے لیے شہر میں موجود رہتے تھے۔ جس طرح دائم المرض اپنی دوا کرتے کرتے حکیم ہو جاتا بن۔ اسی طرح یہ لوگ مقدمے لڑتے لڑتے ایسے قانون دان ہو گئے تھے کہ میرسروں کو مات کرتے، وکیلوں کی کچھ حقیقت نہ سمجھتے، ڈھونڈ ڈھونڈ کر لڑائیاں مول لیتے اور تلاش کر کے جھگڑے خریدتے۔ قرب و جوار میں یہ لوگ ایسے لڑاکو اور جھگڑاؤ مشہور تھے کہ لوگ ان سے رشتہ نہ کرتے ڈرتے تھے۔ رقعہ کا پہنچنا تو بہت بڑی بات تھی۔ اگر ان کے یہاں جھوٹوں بھی تذکرہ ہوتا اور یہ چاہتے تو سچوں سر ہو جاتے اور کچھ ایسے قانونی اڑنگے لگاتے کہ کسی کی ایک نہ چلتی مگر بتانا کو کوئی دوسرا گھر نہ تھا۔ خدا نے ایسا ان کے غرور کو ڈھایا کہ کس کا پلنگ اور کہاں کا دیکھنا بھالنا۔ بتانا کی ماں گئیں اور منگنی ٹھہرا کان دبا کر چپکی چلی آئیں۔ اور اگر ذرا بھی چیں چپڑ کرتیں تو فوجداری کے استغاثوں اور دیوانی ناشوں کے مارے ہوش بگڑ جاتے۔ اب بتانا کی منگنی کو منگنی نہ سمجھو بلکہ بیچ ڈالنا یا غلام بنا دینا یا عرقید۔ سدھیا نے تو برابر ہی کے اچھے ہوتے ہیں۔ خیر اٹھارہ بیس تک کے فرق کا بھی مضائقہ نہیں مگر یہاں تو سیدنگروالوں کی اس قدر ہیبت چھا رہی تھی کہ جیسے کسی بڑے جابر کو تو ال کی۔ ادھر سے حکم ہوتے تھے، ادھر سے تعمیل۔ ادھر سے فرمائش ادھر سے بجا آوری ادھر سے تاز ادھر سے نیاز۔ بعد چندی انہوں نے کہا! بھیجا کہ



اگلے مہینے کی دسویں کو اس طرح ساز و سامان کے ساتھ بارات یہاں پہنچے سو ویسا ہی ہوا۔ بیس ہزار روپیہ کا مہر ماننا ہوگا اور مان لیا ہزار روپیہ جوڑے چڑھاوے کا نقد دینا ہوگا اور دیا پچیس روپے مہینہ پٹاری کا خرچ لکھوانا چاہا اور لکھوا لیا۔ مگر بات یہ ہے کہ سید گمروالوں نے بیٹی کو دیا بھی تو اتنا کہ سونے کا پلنگ تو نہ تھا۔ شاید ان کے ہاں کا دستور نہ ہوگا۔ مگر گلے اور کانوں اور سر کا سارے کا سارا زیور دو ہر اماں جزاؤں الگ، شادی بیاہ اپنے نام کے مطابق کیا دلی میں اتنا جہیز ماننا مشکل تھا۔ لوگ باہر کی شو بھا اور مال اور اسباب کی فہرست دیکھ کر پانچ ساڑھے پانچ ہزار کا جہیز آگتے تھے، اوپر کا خرچ الگ، سو گھر کا دھڑیوں گھی اور منوں غلہ زمینداروں کے یہاں اس کا حساب کیا۔ انیسویں برس بتانا کا بیاہ ہوا۔ جہیز کے اعتبار سے تو دلہن بہت اچھی پائی۔ ذات جماعت کچھ پوچھنی نہ تھی سگی پھوپھی کی بیٹی۔ رہی صورت کوئی خاص چیز تو چند ابری نہ تھی بلکہ الگ الگ دیکھو تو رنگ بھی گورا نہیں تو کھلتا ہوا چمپئی، آنکھوں کا، دہانہ ماتھا، مانگ کسی میں کوئی خاص سیب نہ تھا۔ ہاں چہرے کی مجموعی بناوٹ میں خدا جانے کیا بات تھی۔ نزاکت اور جسم میں جامہ زہین نہ تھی۔ ہزار بیسیوں میں بیٹھی ہو تو صاف پہچان پڑتی کہ باہر کی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ بتانا کے پہلو میں رہی ہی اور بھی بے رونق معلوم ہوتی تھی۔ جن دنوں بتانا کا بیاہ ہوا وہ اپنے آپ میں نہ تھا۔ نشہ شباب میں سرشار اور بدست سیر تماشوں میں منہمک۔ وہ اپنے بیاہ برات کی خبر سن کر خوش ہوتا تھا۔ مگر صرف اس لیے کہ ناچ دیکھنے میں آئیں گے۔ شادی کی تیاری دیکھ کر مسرت ظاہر کرتا تھا۔ مگر اس غرض سے کہ گانا سنیں گے وہ اگر سمجھ کو کام میں لاتا تو اس کی سمجھ زیا تھی اور جان سکتا تھا کہ بیاہ کیا چیز ہے اور بیاہ سے کس طرح کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں مگر وہ دنیا کے کام میں مطلق غور کرتا ہی نہ تھا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی بیاہ کے انجام کو نہ سوچا۔ اس نے نکاح کے وقت قبلت لے لے کہا گویا کہ کھیل ہے۔ اقرانہ پر دستخط کئے یعنی ہنسی ہے۔ اس کو بی بی کی طرف ملتفت ہونا چاہئے تھا۔ اور ملتفت ہونے کی اس کی عمر بھی تھی مگر اس کی آنکھیں ڈھونڈتی تھیں۔ تاز و کرشمہ، غمزہ و ادا، منک چٹا، وہ شریف زادیوں میں کہاں اور خصوصاً دیہات کی شریف زادیوں میں۔ پس اس نے بی بی کو دیکھا، ناپسندیدگی سے استکراہ سے اور ناخوشی سے اور بی بی کے ساتھ اس کی لٹم لٹم گزرتی گئی اور آپس میں ویسی محبت و موانست پیدا نہ ہوئی جیسے نئے بیاہ ہوئے دو لہا دلہن میں ہونی چاہئے اور عموماً نہیں تو اکثر ہوا بھی کرتی ہے۔ علاوہ اس کے بتانا کو ابھی اپنی ہی پرداخت سے فرصت نہ تھی۔ سوداہنوں کی ایک دلہن تو وہ آپ بناتا تھا۔ بناؤ سنگھار میں ہر دم مسرور، زیب و زینت میں ہر لمحہ مشغول۔ وہ خود اپنے حسن صورت پر اس قدر فریفتہ تھا کہ آئینہ دیکھنے سے کبھی اس کو سیری ہی نہیں ہوتی تھی۔ اس کو یہاں تک ضبط نے گھیر رکھا تھا کہ راستہ چلتا تو مڑ مڑ کر اپنے سائے کو دیکھتا جاتا۔

## بتلا کی مصیبتوں کا آغاز اور اس کی بدکرداریاں

بیاہ تک بتلا کی زندگی نہایت ہی بے فکری سے گزری۔ اس نے چودہ برس کی عمر تک گھر میں ایسے عیش و آرام کے ساتھ پرورش پائی کہ کم تر کسی کو نصیب ہوتی ہے، مگر اس کے یار دوستوں نے ماں باپ سے بڑھ کر اس کی ناز برداریاں کیں۔ مگر اب اس کے عیش کی مدت آرام کی مہلت پوری ہو چکی تھی اور یہی حال دنیا کی تمام حالتوں کا کہ راحت ہے تو ایک وقت خاص تک اور مصیبت ہے تو وہ بھی ایک میعاد مقررہ تک۔ نہ اس کو ثبات اور نہ اس کو قیام۔ وہ عارضی اور یہ چند روزہ جن کو خدا نے عقل سلیم دی ہے وہ ہر حالت کو اسی طور پر انگیز کرتے ہیں کہ اس کے زائل ہونے پر ان کو ملال نہ ہو تا۔ ف نہ کرنا پڑے۔ اتنا نہیں کھاتے کہ نغمہ ہو۔ ایسے دوڑ کر نہیں چلتے کہ ٹھوکر لگے۔ عادتوں کو طبیعت نہیں ہونے دیتے اور امور اتفاقی کو ضروری نہیں سمجھ لیتے۔ لیاقت یا ہنر یا صفت یا جو ہر یا خوبی یا مابہ الامتیاز لعل مرماہ فخر و ناز یا ذریعہ تعریف یا وسیلہ تقریب جو کچھ سمجھو۔ بتلا کے پاس ایک حسن صورت تھا۔ اور پس میں ایک چیز تھی جس کی وجہ سے وہ ہر دلعزیز تھا۔ یہی عمل تھا۔ یہی تسخیر تھی۔ یہی کیمرہ اور یہی اکسیر تھی۔ مسیں تو اس کی سترتھیں برس بھینگے لگی تھیں۔ اٹھارہویں میں تو اس کی اچھی خاصی ڈاڑھی نکل آئی۔ شعر۔

گیا	حسن	خوباں	دل	خواہ	کا
ہمیشہ	رب	نام	اللہ	کا	کا

اور ڈاڑھی بھی نکلی تو اس کثرت سے کہ ماتھا اور ناک اور آنکھوں کی جگہ چھوڑ کر کہیں تل دھرنے کو جگہ باقی نہ رہی۔ جب ڈاڑھی نکلنے کو ہوئی اگر بتلا اس کو اس کے طور پر نکلنے دیتا تو برس سوارس وہ اور بھی حسینوں کے زمرے میں گنا جاتا اور سبزہ خط اس کی گوری رنگت پر خوب کھلتا مگر اس نے غلطی یہ کی کہ روئیں نمودار ہوتے ہی استرا پھر وادیا۔ استرے کا پھر وانا تھا کہ پھد پھد کر ایک جگہ دس روئیں اور روؤں کی جگہ کالے کرخت بال نکل پڑے اور چہرے کی جلد پر جو ماء اشباب کا ایک قدرتی روغن تھا وہ بھی گیا گزرا ہوا اب روکھی کھال رہ گئی اور اس پر ہزار بابال۔ یہ پہلی مصیبت تھی جو بتلا پر نازل ہوئی اور اس نے اس پہلی کیفیت کے اس قدر جلد زائل ہو جانے کا سخت رنج کیا اور جب اس کے ان دنوں کے خیالات پر نظر کی جاتی ہے تو اس کا رنج حق بجانب بھی تھا۔ رفتہ رفتہ زوال حسن کا اثر اس کی حالت پر مترتب ہونے لگا جو لوگ اس کی ملاقات کے مشتاق رہتے تھے نفرت اور جو درپے تھے گریز کرنے لگے۔

یار      اغیار      ہو      گئے      اللہ  
کیا      زمانے      کا      انقلاب      آیا

گرم صحبتوں کی جگہ صاحب سلامت رو گئی وہ بھی دور کی۔ اختلاف کے عوض راہ گزر کی مڈ بھیڑ وہ بھی اتفاقی۔ اس کی طرز زیست نے ادعائی ضرورتوں کو اور ادعائی ضرورتوں نے خرق کو اتنا بڑھا دیا تھا کہ مدرسے کا وظیفہ اور اس اک چہار چند اور اس کو بمشکل وفا کرتا۔ اب ادھر تو اس کے اعوان و انصار دست کش ہوئے ادھر جو گھر سے مدد ملتی تھی۔ اس میں بی بی نے حصہ بٹا کر شروع کیا۔ ضرورتیں اگر جائز اور واجب ہوئیں گھر سے مدد ملتی۔ مگر حاجتیں ناجائز، اغراض بے ہودہ، گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل جی لپٹاتا اور ناچار ضبط کرتا۔ طبیعت بھر بھرتی مجبوری پتے کو مارتا۔ انگریزی کی کہاوت ہے کہ مصیبتیں ایک ایک کر کے نہیں آتیں یعنی جب آنے کو ہوتی ہیں تو بس ایک تار بندھ جاتا ہے۔ بتانا کے بیاد کے بعد سے تو گویا اس کہاوت کے بچے کرنے کو موتیں کچھ ایسی تار بڑ توڑ ہوئیں کہ پانچ برس کے اندر ہی اندر جتنے بزرگ تھے کیا مرد کیا عورت ایک کے بعد ایک سبھی رخصت ہوئے۔ بہنیں بیاہی جا کر اپنے اپنے گھروں میں آباد تھیں، بس اب تن تنہا بتانا رہ گیا اور ایک بی بی تو وہ بھی اس کی بے اتفاقی کی وجہ سے پہلے تو اکثر میکے میں رہتی تھی۔ چوتھے پانچویں مہینے داخل سر سال آ گئی تو آ گئی۔ اب کوئی برس دن ہوا تھا کہ ماں اور باپ دونوں کے مرجانے سے بھائیوں نے تر کے سے محروم کرنے کے لیے بلانا چاہا۔ مطلقاً موقوف کر دیا تھا۔ اور بے مجبوری نہایت کس پھر سی کی حالت میں بتانا کے یہاں ڈھنڈی دیئے پڑی تھی۔ بتانا پر مصیبتوں کا ایسا پہاڑ ٹوٹا تھا کہ اگر وہ ذرا بھی عقل سلیم رکھتا ہوتا تو ساری عمر اس تازیانے کو نہ بھولتا، مگر اس کے دل پر تو مہر لگی ہوئی تھی اور آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ کیسی عبرت اور کس کا ڈرنا مطلق العنان ہوتے ہی لگا دکلی دوڑنے پو یہ بھاگنے۔ یہاں تک کہ جن حرکتوں کو پہلے چراتا چھپاتا، اب کھلے خزانے ان کے کرنے میں ذرا بھی نہ شرماتا، باپ کے مرتے ہی میدان خالی پا کر تعزیت کے حیلے اور غم گساری کے بہانے سے دوست آشناؤں نے پھر اس کو آ گھیرا۔ اور پھر وہی اپنی قدیم پیٹی اس کو پڑھا چلے چلم بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ جلسے شروع ہو گئے۔

## بتلا کے چچا کا حج سے واپس آنا

بتلا کے حقیقی چچا میر متقی ایک مدت سے نواب رام پور کی سرکار میں نوکرتھے اور وہیں ایک شریف خاندان میں انہوں نے اپنا نکاح بھی کر لیا تھا۔ بتلا ان دنوں مکتب میں پڑھتا تھا کہ میر متقی ولی ہو کر بھائی سے ملتے ہوئے حج کو گئے۔ ارادہ تو صرف حرمین شریفین کی زیارت کا کر کے گئے تھے مگر وہاں پہنچ کر یہ خیال ہوا کہ سالہا سال کے ارادے میں تو اب بہ مشکل گھر سے نکلنا ہوا کیا معلوم اب زندگی میں پھر یہاں آنا نصیب ہو یا نہ ہو۔ لاؤ لگتے ہاتھوں جہاں تک ہو سکے زیارتیں تو کر لو۔ پورے تین برس تو زیارتوں میں لگے۔ پھر تین برس تک متواتر ایسا اتفاق پیش آ گیا کہ جب واپس کا ارادہ کرتے تھے بیمار ہو جاتے تھے۔ غرض ساتویں برس لوٹے تو بمبئی میں پہنچ کر انہوں نے ارادہ کر لیا تھا کہ بھوپال میں استاد سے احمد آباد میں پیر سے اور دہلی میں بھائی سے ملتا ہوا رام پور جاؤں گا۔ دہلی میں داخل ہوئے تو تھوڑی رات گئی تھی سیدھے بھائی کے دروازے پر آکھڑے ہوئے، کیا دیکھتے ہیں کہ پھانک بند اور طبلے کی تھاپ کی آواز سی چلی آرہی ہے۔ سمجھے کہ ناچ ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر میں بڑے زور کے قہقہے سنائی دیئے معلوم ہوا کہ بھانڈ نقلیں کر رہے ہیں۔ میر متقی کو پہلے ذرا سادھو کا ہوا کہ میں نے گھر کی شناخت میں تو غلطی نہیں کی، گلی کے ککڑ تک لوٹ کر گئے۔ ادھر دیکھا ادھر نگاہ کی، بے شک سات برس کے عرصے میں تھوڑے بہت تغیرات بھی ہوئے مگر نہ اس قدر کہ جہاں آدمی پیدا ہوا، پرورش پائی، بڑا ہوا رہا سہا اس گھر کو نہ پہچانے۔ پھر خیال ہوا کہ شاید بھائی نے اس گھر کو چھوڑ دیا ہو۔ اسی سوچ میں کھڑے تھے کہ ایک شخص گلی کی طرف لپکا ہوا چلا آ رہا تھا۔ جب ان کے برابر آیا انہوں نے اس سے پوچھا کیوں صاحب یہ کوئی گلی ہے۔ وہ یہ کہتا ہوا اپنی دھن میں چلا گیا کہ اس کو سادات کا کوچہ کہتے ہیں۔ اب ان کو اس کا تو یقین کامل ہو گیا کہ گھر کے پہچاننے میں مجھ سے غلطی نہیں ہوئی۔ اب اتنی بات اور رد گئی کہ بھائی اس گھر ہیں یا نہیں۔ اس شخص کی جلدی نے ان کو اس کے پوچھنے کی مہلت نہ دی، اتنے میں دیکھا کہ ایک بوڑھے سے آدمی بغل میں بچھونا دبائے لکڑی میکتے ہوئے اندر گلی سے آہستہ آہستہ چلے آ رہے ہیں۔ ان سے تھوڑی دور پیچھے ایک جوان سا آدمی ہے اور وہ تیز چل رہا ہے۔ یہاں تک کہ جب بڑے میاں کے برابر آیا تو کہنے لگا کہ اے حضرت خیر ہے۔ یہ اس وقت آپ بچھونا لئے ہوئے کہاں جا رہے ہو۔ لایو بچھونا مجھ کو دیجئے میں پہنچا دوں، بڑے میاں نے کہا، نہیں بھائی تم کیوں تکلیف اٹھاؤ۔ بچھو نے میں ایسا کیا بوجھ ہے۔ کیا کریں جب سے بے چارے میر مہذب مرے ان کا لڑکا خدا اس کو نیک ہدایت دے، بری صحبت میں پڑ کر ایسا آوارہ ہو رہا ہے کہ سارے سارے دن اور ساری ساری رات گھر میں دھماچو کڑی مچی رہتی ہے۔ ہم ٹھہرے دیوار بچے ان کے پڑوسی اتنا نہیں بن پڑتا

کہ گھر میں دو رکعت نماز اطمینان سے پڑھی جائے۔ ناچار میں تو اس مسجد میں چا جاتا ہوں۔ متقی بھائی کے مرنے کی خبر سن کر قریب تھا کہ چکر کھا کرو ہیں زمین پر گر پڑے مگر آدمی تھا دین دار اس نے انا للہ وانا الیہ راجعون ۱۰ کہہ کر ضبط کیا اور اپنے تئیں سنبھالا اور سوچا کہ اگر گھر چل کر دستک دوں پکاروں تو نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنے گا اور فرض کیا چیخنے چلانے سے دروازہ کھلا بھی تو رات گئی بنے زیادہ سب کو تکلیف ہوگی۔ رونا پیٹنا مجھے گا۔ ماتم برپا ہوگا۔ بہتر بنے کہ رات کو کہیں پڑا ہوں۔ پھر خیال کیا کہ پاس کے پاس اسی مسجد میں ٹھہر جانا مناسب بنے کہ بڑے میاں سے اور حالات بھی دریافت ہوں گے۔ مسجد میں گیا اور وضو کر کے نماز پڑھی دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ بھائی سے اس کو محبت تھی بہت۔ یوں بھی ہمیشہ غائبانہ اس کے حق میں دعائے خیر کیا کرتا تھا۔ اب حضرت موتی کی دعا آئی اور اس کے منہ سے نکلا ”رب اغفر لی ولا خی وابلخنا فی رحمتک وانت ارحم الراحمین“ ۲۰ جی بھڑ آیا اور بے اختیار اتنا کہ بچکی بندھ گئی۔ جس کے دل کو یکایک اتنا بڑا صدمہ پہنچا ہوا اس کو بھوک کیا لگے اور نیند کیونکر آئے۔ ساری رات گزر گئی کہ صحن مسجد میں ننگے سر بیٹھا ہوا۔ کبھی کچھ پڑھ کر بھائی کی روح کو بخشا بنے اور کبھی اس کی مغفرت کے لیے خدا کی درگاہ میں زار نالی کرتا تھا۔ سفید صبح نمودار ہوتے ہی اول وقت فجر کی نماز پڑھی اور پھر اشراق تک معمولی اوراد میں مشغول رہا۔ جب فاقہ اشراق ۳۰ سے فارغ ہوا تو دیکھا کہ بڑے میاں بھی اپنا بچھونا لپیٹ لپاٹ کر گھر جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ ان کو ضعیفی کے سبب ذرا دھندلا بھی نظر آتا تھا۔ متقی نے ان کو پہچان کر اسلام علیکم کی اور قریب جا کر اپنے تئیں پہچوایا اور رات کا ماجرہ دیکھ سنایا۔ ملے تو میر مہذب کی صحبتوں کو یاد کر کے بڑے میاں بھی آب دیدہ ہوئے اور متقی تو رات سے رو رہا تھا۔ سفر کی تکان، ساری رات کا فاقہ، جاگنا اور رونا آنکھیں سوچ گئی تھیں، منہ سے آواز نہیں نکلتی تھی۔ بارے بڑے میاں نے بہت کچھ سمجھایا۔ دنیا کے دستور کے مطابق صبر کی تعلیم کی اور کہا کہ میاں مرحوم تو اللہ کے نیک بندے تھے۔ یہاں بھی اپنی اچھی گزار گئے۔ اور انشاء اللہ وہاں بھی ان کے لیے اچھا ہی اچھا بنے۔ وہ اگر مرے تو اپنی عمر سے مرے اور ایک نہ ایک دن سبھی کو مرنا بنے۔ بڑا رونا ان کے فرزند ناخلف کا بنے کہ اپنے کردار ناسزا سے مرحوم کی روح کو ایذا دے رہا بنے۔ اب تم باپ کی جگہ ہو۔ خدا کو کچھ بھلا کرنا منظور بنے کہ تم کو بھیجا۔ ابھی وقت بنے۔ اگر چہ تنگ بنے۔ موقع بنے گواخیر بنے۔ اور تم یہاں مسجد میں اکیلے بیٹھ کر کیا کرو گے۔ میرے ساتھ چلو تمہارے نتیجے صاحب تو کہیں دوپہر تک انھیں گے وہ بھی اٹھائے سے تب تک میرے گھر کچھ ناشتہ کرو ہم بھی کچھ غیر نہیں ہیں۔ تمہارے بھائی صاحب خدا ان کو جنت نصیب کرے ہم کو عزیزوں سے بڑھ کر سمجھتے تھے، کیا تم کو یاد نہ ہوگا۔ غرض میری متقی بڑے میاں کے ساتھ ساتھ چلے تو سارے رستے بھائی کا تصور پیش نظر تھا اور قدم قدم پر ایسا خیال ہوتا تھا کہ بھائی سامنے سے چلے آ رہے ہیں پیچھے سے پکار رہے ہیں۔ اس دروازے پر

کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔ اس دوکان والے سے کچھ کہہ کر رہے ہیں۔ کیونکہ یہ اتفاقات متنی کو بھائی کی زندگی میں صدمہ بار پیش آ چکے تھے۔ ان ہی باتوں کی یادداشت اب تازہ ہو گئی تھی رات سے بہتیرا وہ بھی چکا تھا اور اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ اب رونا آئے گا بھی تو روکوں گا، ضبط کروں گا مگر جوں جوں گھر کی طرف پاؤں اٹھتا تھا۔ دل کی کیفیت متغیر ہوتی چلی جاتی تھی۔ یہاں تک دروازے پر پہنچ کر تو نہ تھم سکا اور بے اختیار پکار کر رو یا۔ رونے کی آواز سن کر پاس پرزوں کے لوگ جمع ہو گئے۔ پھانک تو باہر کی طرف سے نہ کھلوا سکے، اندر ہی اندر کھڑکی کی راہ پہلے زنان خانے میں اور پھر مردانے میں خبر پہنچی۔ بتایا اور اس کے جلسے کے شرکاء ابھی تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ کہروں لگا اور بھروسے سن کر سوئے تھے۔ میر متنی کا آنا سن کر

سب کی نیندیں اچاٹ ہو گئیں۔ اور سب کے ہوش اڑ گئے۔ جو لوگ اب سے ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے بھانڈوں اور رنڈیوں کو نچوا رہے تھے۔ اب لگے آپ ناچے ناچے پڑے پھر نے، چاہتے تھے کہ نکل بھاگیں مگر راستہ کہاں تھا۔ پھانک پر تو خود میر متنی صاحب اور ان کے ساتھ محلے کے چالیس پچاس آدمی کھڑے ہوئے تھے۔ زنان خانے میں ہو کر جانا چاہتے تو پہلے مہرے پر گھروانی تھی کہ وہ میاں کے سامنے تو لومڑی یا بیگی بلی جو کچھ تھی سو تھی مگر ان بد ذاتوں کے حق میں خاص کر اس وقت شیرنی سے کم نہ تھی۔ اس کے علاوہ زنان خانے سے اگر باہر جانے کا راستہ تھا تو دوسرے لوگوں کے گھروں میں سے ہو کر تھا۔ وہ بھلے مانس ان بلاؤں کا اپنے یہاں سے ہو کر گزرتا کیوں جائز رکھتے۔ غرض وہ سب کا ٹیٹانا اور ایک کا ایک سے پوچھنا اور ایک ایک سامنے ہاتھ جوڑنا۔ ایک ایک کے پاؤں پر نایک تماشا تھا۔ قابل۔ میر ایک کیفیت تھی لائق دید کہ رنڈیاں جو اپنے حسن کے غرور میں کسی کے ساتھ سیدھی بات نہ کرتی تھیں۔ اب ایک ایک کے آگے بچھی جاتی تھیں کہ خدا کے لیے کہیں ہم کو پناہ دو۔ ایک ایک کے پیچھے لپٹی تھیں کہ لٹہ ہمیں نکال کہیں لے چلو ایک پکارتی تھی میں انعام و اکرام سے باز آئی مجھے راستہ بتاؤ۔ دوسری چلاتی تھی۔ مجھے مجرے کی کوڑی مت دو مگر کسی ڈھب سے گھر پہنچاؤ۔ رات کے جلسے میں ایک طائفہ چلبلا بھانڈا کا بھی تھا۔ ان کم بختوں کو فی الوقت خوب سوجھتی ہے۔ ادھر تو یہ تمام بل چل مچی ہوئی تھی اور ادھر چلبلا بے طالب، بے فرمائش تیار ہوا، اپنے ہاتھیوں کو جمع کر کے لگا نقل کرنے۔ (نقل)

ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر دوڑ دوڑا، لوگوں کو ہٹاتا ہوا دبا دبا ہوا پھرنے لگا کہ کیا ہے اب کیا ہے۔ کاب کاغل ہے کیوں شور مچا رکھا ہے۔

دوسرا بولا: ابے احمق تو نے نہیں سنا کہ حضرت کے چچا مکہ معظمہ سے تشریف لائے ہیں۔

پہلا: کون چچا، ابو جہل یا ابولہب۔

دوسرا: (پہلے کے منہ پر زور سے ایک طمانچہ مار کر) چپ مردود کیا کفر بکتا ہے۔ اب حضرت پیغمبر صاحب کے چچا نہیں۔

ہمارے (بتلا کی طرف اشارہ کر کے) حضرت پیر و مرشد کے چچا۔

پہلا: ہاں الحمد للہ پھر ڈرنا کیا ہے۔ آؤ ہم سب مل کر بھی ان کو چچا بنائیں۔ حج نصیب ہونے اور سلامتی سے واپس آنے کی مبارکباد دیں۔ ناچ دکھائیں گانا سنائیں ”دوسرا (پہلے کے منہ پر طمانچہ مار کر) ابے تو بہ کر تو بہ کہیں اوپر سے چھت نہ گر پڑے سید آل رسول مولوی حاجی جو ابھی خدا کے گھر سے پھرے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ کہیں ناچ دیکھتے ہیں۔ ناچ دیکھنا حرام یا گانا سنتے ہیں (گانا سننا ممنوع) ان کے نزدیک رنڈیاں جہنم کی چھٹیاں ہیں اور بھانڈ دوزخ کے کندے)

پہلا: بابائے میرے اللہ رنڈیوں نے وہاں بھی بھانڈوں کو نہ چھوڑا۔ نرے کندے ہوتے تو ذرا دیر میں تو جلتے اور کیوں صاحب یہ سب لوگ (بتلا اور اس کے ساتھیوں کی طرف اشارہ کر کے) کیا ہیں گے؟“

دوسرا: ان کو کہتے ہیں کہ بھاڑ میں بھونے اور کڑھائی میں تلے اور بھٹی میں جلائے جائیں گے۔

پہلا: (دونوں ہاتھوں کو کلوں پر ہولے ہوئے تھپڑ مار کر اور خوفزدہ آنکھیں بنا کر) الہی تو بہ الہی تو بہ دوزخ کی آج سے بچائے اور بھانڈوں کو بھوت بنائے۔ آسیب بنائے۔ جو چاہے سو کرے۔ مگر دوزخ کے کندے نہ بنائے۔ بھلا پھر یہ حاجی صاحب چاہتے کیا ہیں؟

دوسرا: ”چاہتے یہ ہیں کہ نمازیں پڑھو، روزے رکھو، خدا کی بندگی کرو، جو روپیہ رنڈیوں اور بھانڈوں کو دیتے ہو، غریبوں، محتاجوں کو دو۔“

پہلا: ”بھئی بات تو واجبی ہے۔ رنڈیوں کو دینا تو محض فضول ہے۔ رب بھانڈ، ان سے بڑھ کر غریب محتاج اور کون ہوگا۔“ یہ کہہ کر غما مہ باندھ پانچے مخنوں سے اونچے کر جہاں کھڑا تھا اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھ اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ گویا امام بنا اور نماز شروع ہوئی مسخر دین تو یہ تھا کہ نیت باندھ چکا اور پھر ایک طرف یہ کہہ رہا ہے کہ بس بے تامل پھاٹک کھول دو اور مولوی یا حافظ یا حاجی یا زوار یا واعظ جو ہوں ان کو آنے دو اور دوسری طرف سب کو اشارہ کر رہا ہے کہ میرے پیچھے مقتدی بن کر کھڑے ہو جاؤ اور بڑبڑانے لگا۔ طائفے کے جتنے بھانڈ تھے سب صف بستہ ہو کر مقتدی بنے اور اس کے پیچھے کھڑے ہوئے۔ ذرا دیر گزری تھی کہ ایک نے صف میں سے نکل کر امام کی پیٹھ پر ایک دو ہتھ مارا ایسے زور سے کہ تھوڑی دور آگے جا کر اوندھے منہ گر پڑا۔

کہا ”ابے بدعتی یہ کیسی بے وقت اور بے رخی جماعت کی نماز پڑھ رہا ہے۔ اگر مولوی اسماعیل کے مقلد سن پائیں تو مارے کفر کے فتوؤں کے اتوا کر دیں۔“

امام: ”ابے تو کیا جانے یہ صلوٰۃ الخوف ہے اور پھر اسی طرح اپنی جگہ جا کھڑا ہوا۔ گویا اتنی حرکت پر بھی نماز باطل نہیں ہوتی۔ تھوڑی سی دیر کے بعد پیچھے کی صف سے پھر ایک شخص آگے بڑھا اور اس نے امام کا عمامہ اتار تڑاڑ آٹھ دس بیس لیتے رہے رسید کئے۔ امام سہلانا ہوا یہ کہتا ہوا بھاگا کہ کفر کا فتویٰ آیا تو یہ لیتے رہے مارنے والا کیا کہتا ہے۔ ابے ڈرو مت فتویٰ نہیں تیری عبادت کا صلہ ہے۔

امام بولا عبادت کا صلہ ہے تو اس میں مقتدیوں کا بھی حق ہے۔ پھر تو اس سرے سے اس سرے تک بلا امتیاز جوتی کاری ہونے لگی اور رنڈیوں اور بھڑولے اور میر محفل اور تماشائی سبھی پر آفت آئی۔ کہتے ہیں کہ چلبلا بھانڈ کے طائفے کا بیس روپے روز معمول تھا اور بتا! اس طائفے کا ایسا گرویدہ تھا کہ اگر خرچ مساعدت کرتا تو ہر رات ان کا ناچ دیکھتا مگر اس پر بھی کئی سو روپے ان لوگوں کے چڑھ گئے تھے۔ اب بتا! کے چچا کا آنا سن کر بھانڈوں کو بالکل ناامیدی ہو گئی اور ایسی نقل کی نقل تو نہایت برجستہ تھی، مگر طبیعت کس کی حاضر تھی۔ اور دل کس کا ٹھکانہ تھا کہ مزد لیتا اور داد دیتا۔ بتا! کی تو ایسی مٹی بھولی کہ ننگے پاؤں کبھی اندر جاتا اور کبھی باہر آتا۔ مگر کوئی تدبیر بن نہ پڑتی تھی۔ آخر اس نے اپنے باپ کے پرانے نوکر وفادار کو آواز دی۔ یہ بوڑھا آدمی اسم باسمی بتا! کو بہت سمجھاتا رہتا تھا مگر نوکر کی بساط کیا۔ جب وفادار نے بار بار کہنا شروع کیا بتا! نے اس کو جھڑک دیا۔ وفادار نے دل شکستہ ہو کر بتا! سے کنارہ کشی اختیار کی۔ مردانے میں اس کے رہنے کی ایک کوٹھڑی تھی۔ رات دن اسی کوٹھڑی میں پڑا رہتا۔ اندر سے کچھ فرمائش آتی تو اس کی تعمیل کر دیتا۔ بتا! کے کسی کام کاغ کو ہرگز ہاتھ نہ لگاتا۔ آدمی تھا زاماندید سمجھ چکا تھا کہ یہ لیل و نہار اس طرح پرتو سدا چلنے والا نہیں یا تو یہ رسم و راہ نہیں اور رسم و راہ یہ ہے تو بندہ درگاہ نہیں۔ وفادار اکیلا کوٹھڑی میں بیٹھا ہوا دیکھتا نہیں تھا تو سنتا سب کی تھا۔ اس کو میر متقی کا آنا اور ارباب جلسہ کا گھبرانا معلوم ہو چکا تھا۔ خلاف عادت بتا! کے بلانے کی آواز سن کر مطلب تو سمجھا مگر جان بوجھ کر چار دتار لیٹ گیا۔ بتا! نے ایک بار پکارا دو بار پکارا تین بار پکارا۔ جواب نہ ارد۔ اگر کبھی پہلے ایسا اتفاق ہوا ہوتا تو وفادار کی مجال تھی کہ بتا! پکارے اور پہلی آواز پر جواب نہ دے مگر میر متقی کا آنا تھا کہ باہر سے اندر تک سب کا رنگ بدل گیا۔ جو ناجیز تھے وہ اب عزیز تھے جو بااقتدار تھے وہ اب ذلیل و خوار تھے۔ یہاں تک کہ بتا! نے خود کوٹھڑی کے دروازے پر آکر پکارا۔ میاں وفادار۔ میاں وفادار جلدی اٹھو چچا آئے۔ وفادار نے گھبرا کر پوچھا کیا جھوٹے میاں حج سے تشریف لائے۔

بتا! ”ہاں“ وفادار نے میر صاحب مرحوم کو یاد کر کے ایک آدمی اور آنکھوں میں آنسو بھرا لیا۔ اور میر متقی کے صحیح و سلامت واپس آنے پر خدا کا شکر کیا اور دروازے کھولنے کے ارادے سے دوڑا۔ بتا! نے لپک کر روکا کہ ذرا ٹھہرو۔ ذرا ٹھہرو۔ بتا! نے چچا کو دیکھا تو تھا مگر سات برس میں صورت بھول گیا تھا۔ وفادار سے کہا کہ ذرا کواڑوں کی درز میں جھانک



کرتو دیکھو وہی ہیں۔ وفادار نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا اور کہا کہ بے شک وہی ہیں اور اب تو میں سرکار کے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ڈاڑھی میں تو ویسی سفیدی نہیں۔ بتانا یہ سن کر وفادار کے گلے سے لپٹ گیا اور کہا کہ خدا کے لیے کسی طرح مجھ کو اس نصیحت سے بچاؤ۔ میں ان کم بختوں کو کہاں لے جاؤں اور کس طرح چھپاؤں۔ وفادار کو بتانا کا اضطرار دیکھ کر بہت ترس آیا اور اس نے کہا تھوڑی دیر کے لیے ان لوگوں کو پاخانے کھڑا کر دیجئے۔ چھوٹے میاں آخر اندر آ جائیں گے۔ اس وقت ان کو نکال باہر۔ واقع میں اس کے سوا کوئی تدبیر ہی نہ تھی۔ آخر یہی کیا کہ چھپا چھپ ان سب کو پاخانے میں اوپر تلے ٹھونس، آگے پیچھے دھکیل، کندی لگا، باہر کا پھانک کھول دیا۔ میر منقی نے دوڑ کر نتیجے کو چھاتی سے لگایا اس وقت کی کیفیت بھی جس جس نے دیکھی ساری عمر اس کو نہیں بھول سکتا، بوڑھا پھونس نہیں مگر ادھیڑ اور جوان فرشتہ اور شیطان یا رحمت اور قہر یا نیکی اور بدی یا ثقہ اور رند یا حاجی اور پاجی یا چچا اور بھتیجا دونوں ایک دوسرے کے گلے لگے ہوئے کھڑے رو رہے تھے۔ بتانا تو دھاڑیں مار رہا تھا۔ اور میر منقی کی آنکھوں سے برابر آنسو جاری تھے۔ اور چونکہ رنج کو بہ تکلیف ضبط کرتے تھے، بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی۔ پچاس ساٹھ آدمی حلقہ باندھے ہوئے گرد و پیش تھے اور سب پر رقت طاری تھی۔ کامل پاؤ گھنٹے کے بعد منقی نے بتانا کو سینے سے جدا کیا۔ اور سب کے ساتھ اس کو لے جا کر دالان میں بیٹھے۔ تھوڑی دیر سب سکوت میں تھے۔ آخر کسی نے میر صاحب مرحوم کا ذکر خیر نکالا۔ پہلے ان کے محامد اخلاقؑ کا ذکر کر رہا پھر خالیت اور وفات کا آخر فاتحہ پڑھ کر لوگ رخصت ہوئے اور میر منقی زنان خانے میں گئے۔

بتا! کے چچا میر متقی کا اپنی بھانجی یعنی بتا! کی بی بی کے سامنے تعزیت کے طور پر وعظ کرنا

ماموں کا آنا سن کر بھانجی کو ماں باپ اور ساس سرے کا مرنا۔ بھائیوں کا ظلم اور سب سے بڑھ کر بتا! کا اس سے بے تعلق رہنا۔ اپنی بے کسی گھر کی تباہی آئندہ کی ناامیدی غرض ساری داستان مصیبت اول سے آخر تک یاد آگئی۔ وہ دل ہی دل میں رونے کی تیاریاں کر چکی تھی۔ جوں ماموں نے اندر قدم رکھا۔ اور بھانجی کے ساتھ نظر دو چار ہوئی۔ اس نے کسی طرح لڑکھڑاتے ہوئے کھڑے ہو کر سلام تو کر لیا اور پھر تو ایسی ہلکی کہ غش کھا کر گر پڑی۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ دانت پچی ہو گئے۔ لٹخانے سنگھائے۔ منہ پر گلاب کے چھینے دیئے۔ بارے ہوش آیا تو اس نے ایسے بین شروع کئے کہ سننے والوں کے کلیجے منہ کو آنے لگے۔ دل دہل گئے۔ آخر متقی نے سر پر ہاتھ پھیرا اور سمجھایا کہ مصیبت اس میں قدر رنج کرنا عبودیت کی شان نہیں ہے۔ رنج مصیبت کو نہ ٹال سکتا ہے اور نہ اس کو ہلکا کر سکتا ہے بلکہ الٹا مصیبت کو بڑھاتا ہے۔ جیسے محبت ماں کو اکھوتے بیٹے کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس سے لاکھوں کروڑوں درجے بڑھی ہوئی محبت خدا کو اپنے تمام بندوں کے ساتھ ہے۔ اگر خدا نہ چاہے تو کیا بندے آپ سے آپ پیدا ہو جائیں اور اپنے اختیار سے زندگی کریں۔ ایسا خیال کرنا تو کفر کے علاوہ غلط صریح بھی ہے۔ بندے بھلے اور بڑے امیر اور غریب، قوی اور ضعیف، حاکم اور محکوم، بادشاہ اور رعیت یہاں تک کہ ولی اور پیغمبر سب کے سب اس قدر عاجز اور بے اختیار ہیں کہ بدون خدا کی مرضی کے ایک پتہ بلانا چاہیں تو نہیں بلا سکتے۔ ایک ذرے کو جگہ سے سرکانا چاہیں تو نہیں سرکا سکتے۔ کسی انسان کا نفع و ضرر نہ خود اس کے اختیار میں ہے نہ کسی دوسرے انسان کے۔ دنیا میں جس کسی کو جس کسی کے ساتھ کسی طرح کی محبت ہے۔ اس کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ جس کے ساتھ محبت رکھتا ہے۔ اس کا فائدہ چاہتا ہے۔ نہ یہ کہ اس کو فائدہ پہنچتا ہے یا پہنچا سکتا ہے۔ اس واسطے دنیا کی ساری محبتیں از برائے نام ہیں۔ سچی اور اصل محبت خدا کی ہے کہ ساری نعمتیں اور ساری برکتیں جو ہم کو حاصل ہیں۔ یہاں تک کہ زندگی اسی کی دی ہوئی ہے۔ بایں ہمہ انسان کو اس زندگی میں ایذا نہیں بھی پہنچتی ہیں۔ مگر ان میں ضرور انسان کا کوئی نہ کوئی فائدہ مضمر ہوتا ہے۔ مثلاً طبیب کہ وہ کسی مریض کا علاج کرتا ہے۔ کبھی اس کو کڑوی دوا پلاتا ہے۔ اور کبھی اس کی فصد لیتا اور کبھی بیمار کے زخم کو شگاف دیتا اور کبھی شاید اس کے عضو کو کاٹ بھی ڈالتا ہے مگر ایسا کرنے سے کیا شبہ کیا جاسکتا ہے کہ طبیب اپنے بیمار کے ساتھ عداوت رکھتا ہے۔ اسی طرح جو تکلیفیں ہم کو دنیا میں پہنچتی ہیں اور بلاشبہ خدا کی مقدس مرضی سے پہنچتی ہیں۔ ظاہر میں تکلیف اور باطن میں آرام ابتداء میں ایذا ہیں اور انجام میں راحت۔ اول تو اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ تکلیف حقیقت میں بھی تکلیف ہے یا نہیں۔ فرض کرو کہ کسی عورت کا شوہر مر جائے۔ ظاہر میں بیوگی ایک بڑی

مصیبت ہے۔ مگر کیا یہ ممکن نہیں کہ مرد زندہ رہتا اور بیوی پر سو کن لاکھ اس کو زندہ درگور کرتا یا بیوی سے اس کا دل ایسا پھرتا کہ جب تک جتنا اس کو سخت ایذا دیتا یا ایسے امراض میں مبتلا ہوتا کہ سارے گھر کی زندگی دشوار کر دیتا اور اسی طرح کے اور بہت سے احتمالات ہیں جن کی وجہ سے ایک عورت اپنی بیوی کو ترجیح دے سکتی ہے۔ سہاگ پر بس جب تک انسان کو علم مستقبلات یعنی علم غیب نہ ہو اور وہ اس کو نہ ہو اپنے اور نہ ہو گا۔ وہ کسی حالت کو جو اس پر یا کسی پر طاری ہو برا کہہ نہیں سکتا۔ دنیا کے بہت سے واقعات کو ہم پسند کرتے ہیں۔ مگر جس طرح ہماری معلومات ناقص ہیں۔ اسی طرح جو نتیجے ہم اپنی معلومات سے نکالتے ہیں ناقص۔ ادھوری روداد اس پر فیصلہ نہ کافی تحقیقات اور اس پر تجویز اور مانا کہ جو تکلیف ہم کو پہنچی حقیقت میں تکلیف ہے تو کیا۔ شفیق باپ اپنے پیارے بیٹے کو، منصف اور رحم دل بادشاہ اپنی عزیز رعیت کو تا دیب یا تنبیہ یا اصلاح یا کسی دوسری مصلحت سے ایذا نہیں پہنچاتا۔ ہمیشہ ایسی ایذائیں پہنچتی رہتی ہیں نہ فریاد نہ شکایت۔ پس اگر خدا کی طرف سے ایک ایذا پہنچی جائے (جانے وہ ان بے شمار احسانوں کو اور بھول جاؤ اس کی نامحسوس نعمتوں کو) تو بندہ کیوں منہ پھمائے، کس لئے بڑبڑائے۔ سب سے بڑا فائدہ جو مصیبت سے انسان کو پہنچتا ہے۔ یہ ہے کہ مصیبت دل میں بالتخصیص بغیر واکساری کی صفت پیدا کرتی اور خدا کو یاد دلاتی ہے اور حقیقت میں مصیبت کے وقت بندہ خدا کی طرف رجوع کرتا ہے تو وہ مصیبت نہیں رحمت ہے۔ لیکن خدا کو یاد کرنے اور اس کی طرف رجوع کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ شکایت کرو اور اس سے ناراض رہو۔ بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ اس کی رحمت پر پورا بھروسہ اور اعتماد کر کے صمیم قلب سے یقین کر لو کہ جو کچھ ہوا خوب ہوا۔ مناسب ہوا اور یوں ہی ہونا چاہیے تھا۔ یہ تو درجہ رضا اور تسلیم کا ہے۔ اور اسی کا نام صبر جمیل ہے اور آدمی کو جس کا عقیدہ ضعیف اور دل کمزور اور جس کی ہمت کوتاہ اور جس کا ارادہ متزلزل ہے، اس درجے پر پہنچنا دشوار ہے۔ مگر اعلیٰ علیین پر نہیں پہنچ سکتے۔ تو ایک میٹرھی دو میٹرھی جتنا ہو سکے کچھ تو اچھو کسی قدر تو ابھرو کہ اسفل السفلین کفران سے نکلو۔ یوں کہنے کو تو زبان سے سبھی کہتے ہیں کہ دنیا فانی ہے۔ چند روز ہے، خواب ہے، سراب ہے، سایہ ہے، سحاب ہے، برق ہے، تاب ہے، مگر مصیبت کے وقت بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے۔ کہ زبان ہمارے دل کی سچی ترجمان نہیں۔ کیا کوئی فانی ایک فانی حالت کے لئے اتنا نخل مچاتا اور اس قدر روتا پیٹتا مصیبت پر جو منفعت ہم نے ہمیشہ مترتب ہوتے دیکھی، وہ تو یہ ہے کہ مصیبت آدمی کے مستقبل کو اس کے ماضی سے ضرور بہتر کر دیتی ہے یعنی اگر انسان کامل تھا تو مصیبت کے بعد ضرور چست و چالاک ہو جاتا ہے۔ آرام طلب تھا تو جنش بھولا تھا تو سیانہ، مسرف تھا تو کفایت شعار بد پرہیز تھا تو محتاط، جلد باز تھا تو دھیما، آوارہ تھا تو نیک کردار۔ جس آدمی پر کبھی مصیبت نہیں پڑی نہ اس کی عقل کا ٹھکانا، نہ اس کی رائے کا بھروسہ، نہ اس کا دین درست نہ اس کے اخلاق شائستہ۔ اس کے علاوہ اس کا دستور ہے کہ ایک حالت کیسی ہی عمدہ کیوں نہ ہو، اگر ساری عمر یکسانی کے

ساتھ چلی جائے تو اس حالت کی عمدگی کا احساس نہیں رہتا بلکہ اکتا کر خود اس حالت سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ ایک باورچی کو میں جانتا ہوں جو نمکین اور میٹھے چاول یعنی بریانی تین دنوں وغیرہ پکانے میں کامل استاد تھا۔ شہر میں کہیں نہ کہیں شادی یا نہی کی کوئی نہ کوئی تقریب لگی ہی رہتی تھی جس کے یہاں چاولوں کی پخت ہوئی اتنی باورچی سے پکواتا۔ اور اس کو مزدوری کے علاوہ دستور کے مطابق تہہ دہائی کی چوٹی دار رکابی بھی ملتی و دایک رکابی ایسی ہوتی تھی کہ اس کا سارا گھر اس کو کھاکر اٹل ہو جاتا۔ پس ان لوگوں کو دونوں وقت عمدہ سے عمدہ بریانی اور بہتر سے بہتر تین کھانے کو ملتا تھا۔ پس یہ حالت تھی کہ کسی غریب آدمی کے سامنے جو بریانی تین کو ترستا ہو بیان کیجئے تو سننے کے ساتھ ہی رال ٹپک پڑے مگر اس باورچی اور اس کے اہل و عیال کا کیا حال تھا کہ تین کر کے بریانی تین کی رکابیاں ہمسائے کے لوگوں کو دیتے اور ان سے روٹی چینی مانگ کر کھاتے۔ پس ہم نے تندرستی کی قدر بیماری سے جانی۔ وطن کی پردیس سے تو نگر کی مفلسی سے آرام کی دکھ سے راحت کی مصیبت سے، تو جو شخص حقیقی راحت کا خواہاں ہے ضرور ہے کہ مصیبت کا بھی مزہ چکھے۔ مصیبت زدہ کے لیے سب سے بہتر تدبیر یہ ہے کہ وہ دوسرے مصیبت مندوں پر نظر کرے۔ مثلاً اگر اس کو صرف بیوگی کی شکایت ہے تو پائے گی کہ اس جیسی اور اس سے بدتر لاکھوں بیوہ عورتیں اور بھی ہیں۔ شاید یہ ایک مدت خانہ داری کرنے کے بعد بیوہ ہوئی۔ اور ہزار ہا اللہ کی بندیاں ایسی بھی ہیں جنہوں نے شوہر کی صورت تک نہیں دیکھی۔ پس وہ بیوگی کے علاوہ لادہ بھی ہیں اور شاید ان کو روٹی کا بھی کہیں سے آسرا نہ ہو، پس بیوہ اور لادہ کے علاوہ محتاج بھی۔ نگہری نداری بھی اور شاید دکھیا۔ بیمار اور شاید اندھی اور لولی اور پانچ بھی، کسی کو اگر کھلی کی ایذا ہے تو وہ دیکھے گا اپنے ہی جیسے آدمی کوڑھی اور کوڑھ میں کیڑے اور کیڑوں کے ساتھ زخم اور زخموں میں سوزش العیاذ باللہ۔ جس کی آنکھ میں ناخن ہے۔ کیا اس کو اس سے تسلی نہیں ہوگی کہ دوسروں کی آنکھ میں ٹینٹ یا دوسرے کانزے بلکہ اندھے بھی ہیں۔ غرض دنیا کا حال یہی ہے کہ ایک سے ایک بہتر ہے۔ پس کیوں کوئی مغرور ہو اور ایک سے ایک بدتر ہے تو کس لیے کوئی مایوس ہو۔ بیٹی میں یہ نہیں کہتا کہ تم پر مصیبت نہیں پڑی۔ مگر اس مصیبت پر جو تمہاری حالت ہے شکر کے قابل ہے کہ خدا کے فضل و کرم سے تندرست ہو۔ عزت و آبرو کے ساتھ گھر میں بیٹھی ہو۔ تم نے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلا یا۔ تم نے دروازے دروازے بھیک نہیں مانگی۔ تم نے پیٹ کے واسطے کسی کی خدمت نہیں کی ٹہل نہیں کی۔ گو ماں باپ کو خدا نے اٹھالیا۔ مگر ابھی تمہارے غم گسار تمہارے خبر گیر تمہارے سر پرست موجود ہیں۔ اور ان میں سے ایک میں بھی ہوں کہ باپ جتنی نہیں کروں گا۔ اس سے پورا اطمینان رکھو کہ انشاء اللہ اپنے مقدور بھر تمہارے حال کی اصلاح تمہارے معاملات کی درستی میں کسی طرح کی کوتاہی بھی مجھ سے نہ ہوگی۔ الا و اتی شہر سے بلکہ اسی محلے سے بلکہ اسی کوچے سے بلکہ تمہارے پڑوس سے جتنی عورتیں کہو بلا اتا ہوں جن کو دیکھ کر تم ضرور رحم کرو گی اور

سمجھو گی کہ یہ مجھ سے زیادہ دکھیا ہیں۔ ایک حکیم کا قول ہے کہ دنیا میں ہر شخص خوش ہے اس واسطے کہ وہ اپنی حالت کو کسی دوسرے کی حالت کے ساتھ بدلنا نہیں چاہتا۔ جس دن پہلے پہل میں نے یہ بات کتاب میں لکھی دیکھی تو میں ذرا اس پر ٹھٹھا بھرا میں نے سوچا کہ اس کو میں اپنے ہی اوپر کیوں نہ آزماؤں تو میں نے اپنی جان پہچان کے پانچ چھ آدمی تجویز کئے۔ جن کی حالت تو بنظر ظاہر میں اپنی حالت سے بہتر سمجھتا تھا۔ لیکن اچھی طور پر غور کیا تو ایک اولاد تھے۔ دوسرے بیٹے تو رکتے تھے۔ مگر ناہموار۔ تیسرے دائم المرض۔ چوتھے شدت سے کنجوس۔ پانچویں بیوی کی بد مزاجی اور بد سہینگی اور بد زبانی سے عاجز چھٹے اندھ بے لغرض کسی کو بے داغ نہ پایا۔ تب اس حکیم کے مقولے کی تصدیق اور میرے دل کی تشفی ہوئی اور پھر ایک بات اور بھی سوچنے کے قابل ہے کہ غم کیسا ہی سخت اور صدمہ کتنا ہی بھاری کیوں نہ ہو۔ رفتہ رفتہ خود بخود اس کا اثر منحل ہوتے ہوتے آخر کار محو ہو جاتا ہے۔ کبھی ہمارے ماں باپ بھی مرے تھے ہم بھی ان کے فراق میں تنہا ہی طرح بہتیرا روئے، دھوئے، نمگین اور اداس رہے۔ آخر بھول بسر گئے۔ غرض انسان کو چارونا چار صبر تو کرنا پڑتا ہے کیا کرے دیوار سے سر ٹکرا کر کنویں میں گر کر افیون کھا کر حرام موت مر رہے۔ مگر اس کو صبر محمود نہیں کہتے۔ صبر محمود وہی ہے کہ نزول مصیبت کے وقت ہو۔ جبکہ رنج دل کو نچوڑتا اور کھینچے کو کھرچتا ہے۔ آنسو ہیں کہ نکلے چلے جاتے ہیں۔ اور سانس ہے کہ پیٹ میں نہیں سماتا۔ وہ بندے کے لیے سخت آزمائش کا وقت ہے۔ معاذ اللہ اگر خدا کی شان میں شکایت کا کوئی کلمہ اس کے منہ سے نکل گیا یا اس کے دل میں خدا کی نسبت جل علاہ شانہ بے رحمی یا بے انصافی کا خیال وسوسے کے طور پر بھی آ گیا۔ تو بس دنیا خراب عاقبت برباد الخسر النیا والاخرة و نالک ہو الخسران لمین منتفی نے جو یہ باتیں عقل کی دین کی نصیحت کی بیان کیں تو بھانجی پر ایسا اثر ہوا کہ گویا گرتی ہوئی دیوار کو تھوٹی لگا دی۔ ڈوبتے ہوئے کو اچھال کر کنارے پہنچایا۔ مرجھائے درخت کو پانی دیا۔

## میر متقی کا بتلا کے امور خانہ داری کی اصلاح میں کوشش کرنا

متقی کا ارادہ تو یہ تھا کہ بھائی سے مل کر ہفتہ شرہ درہ کررام پور روانہ ہوں گا۔ مگر سوچا کچھ اور ہوا کچھ۔ یہاں آ کر دیکھا تو بھائی کو مرے ہوئے چھ مہینے ہو چکے تھے اور جتھے صاحب نے وہاں دھم مچا رکھی تھی کہ خدا کی پناہ۔ دو تین مہینے بھی متقی کے پیچھے میں دیر ہوتی تو تنخواہوں کا کرائے کا رہنے کے موروثی مکان کا خاندان کی عزت و آبرو کا بزرگوں کے نام و نمود کا سب کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ باپ کا بیمار پڑنا اور بتلا کا مدرسے سے اٹھنا۔ وہ دن اور آج کا دن اس بندہ خدا نے بھول کر بھی تو مدرسے کو یاد نہ کیا۔ شروع شروع میں دو چار ہم جماعت بلائے کو آئے۔ بعض مدرسوں نے بھی کہا! بھیجا۔ بتلا کس کی سنتا تھا۔ رخصت کی، غیر حاضری ہوئی اور غیر حاضر ہونا تھا کہ نام کٹ گیا۔ بیٹھے بٹھائے اچھا معقول وظیفہ کھویا اور بات کی بات میں آئندہ کی ساری امیدیں ایک دم سے منقطع ہو گئیں۔ جن جن سرکاروں سے تنخواہیں مقرر تھیں ضرور تھا کہ پیروی کر کے وارثوں کے نام ان کا اجرا کرایا جائے مگر یہاں پیروی کرے تو بتلا اور نہ کرے تو بتلا۔ اگر باپ کے مرنے پر بتلا ان سرکاروں میں جاتا تو جن سرکاروں کا جیسا دستور تھا کہیں سے ماتمی خلعت، کہیں سے نقد کچھ نہ کچھ ملتا۔ اور تنخواہ بھی کہیں سے پوری کہیں سے ادھوری جاری ہوتی ہی ہوتی۔ مگر بتلا کو اپنے مشاغل الٰہی یعنی سے اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ ان باتوں کو سوچے اور خلعت یا نقد یا تنخواہ کے لیے سرکاروں میں دوڑ دھوپ کرے۔ غرض جتنے معمولات تھے سب بند ہو گئے اب آمدنی کے نام سے تو رہ گیا کیا صرف کرایہ۔ اول تو وہ تھا ہی کتنا مگر خیر جس قدر تھا اس کا بھی یہ حال ہوا کہ کسی کے دو روپے دینے ہیں اس نے مانگنے نہ مہینہ دیکھا نہ حساب نہ کتاب۔ قلم اٹھا کسی کرایہ دار کے نام چٹھی لکھ دی کہ اس کو دو روپے دے کر کرایہ میں مجرا کرو۔ اب وہ چٹھی والا کرایہ دار کے سر ہوا۔ ہر چند وہ کہتا جاتا کہ بھائی ابھی مہینہ پورا نہیں ہوا۔ میں نے اپنی گرہ سے مرمت کرائی ہے۔ چٹھی والا بے کہ ایک نہیں سنتا۔ کرایہ داروں نے دیکھا کہ الٰہی شہر میں ہزار ہا مکان اور لاکھوں دکانیں ہیں یہ چٹھی کا انوکھا اور زالا دستور نہ دیکھا نہ سنا۔ ایک لمیر صاحب تھے اللہ بخشے کہ ایک مہینے کا کرایہ دوسرے مہینے میں اور دوسرے کا تیسرے میں وصول ہوتا رہتا تھا۔ بے چارے کبھی ایک خن بھی تو زبان پر نہیں لائے۔ انہیں کے صاحبزادے ہیں کہ بے حساب بیٹھے بیٹھے چٹھیاں اڑاتے ہیں۔ گویا کوٹوالی کے پروانے ہیں یا تھانے کے حکم نامے۔ غرض اکثروں نے بیدل ہو کر مکان خالی کر دیئے اور اٹھ کر کہیں اور جارہے ہیں اور جائیداد اس قدر بے نام ہو گئی کہ کوئی دوسرا کرایہ دار رخ نہیں کرتا۔ بتلا کے ہاتھ لگ گیا تھا ماں کا زیور اسی میں یہ تمام گل چھرے اڑا رہے تھے۔ پونے دو ہزار کا زیور

اس مرحومہ کا تھا۔ چھ مہینے میں سب خالصیہ لگ چکا۔ اب مہینے سو مہینے سے ادھار پر گزران تھی۔

منتقی نے جو یہ حال بھائی کے گھر کا دیکھا تو کیونکر ممکن تھا کہ ان لوگوں کو ایسی حالت میں چھوڑ کر چلا جائے۔ ناچار رام پور کا ارادہ سردست فسخ کیا اور بتلا کو ساتھ ساتھ سرکاروں میں لئے لئے پڑا پھرا۔ کسی کے کارپرداز سے ساز باز کی۔ کسی کے داروغہ کو جاگائے۔ سفارش پہنچائی اور جمعی کے مقام پر جمعی کرائی۔ بعض جگہ اپنی وجاہت سے کام نکالا اور جہاں موقع بن پڑا بھائی کے حسن خدمات پر زور ڈالا۔ غرض کئی مہینے کی دما دوش سے اتنا ہوا کہ میر مہذب کے زمان حیات میں جتنی تنخواہیں تھیں بلا کم و کاست پوری پوری کھل گئیں بلکہ بعض سیر چشم سرکاروں نے پچھلے چھ مہینے کی چڑھی ہوئی تنخواہیں بھی بلا وضعات دیں۔ میر منتقی نے ایک پیش بینی یہ کی کہ جس قدر ذاتی تنخواہ تھی یعنی بلا خدمت بطور معاش ماتی تھی۔ اپنی بھانجی غیرت بیگم یعنی بتلا کی بی بی کے نام جاری کرائی اور تنخواہ شرط الخدمت بتلا کے نام۔ اس میں مصلحت یہ تھی کہ بی بی کے آگے بتلا کی ذرا کئی دبی رہے۔ تنخواہوں کا پچھلا چڑھا ہوا روپیہ جس قدر ملا اس سے مکانات اور دکانات کی شکست و ریخت کی درستی کرا کے کرایہ داروں کو بسا کر ان کے سر خط بھی آدھے کرائے کے بتلا کے نام اور آدھے غیرت بیگم کے نام لکھوا دیئے۔ میر مہذب کے روز وفات سے آج تک بیوتات کا حساب پیسے کے یہاں سے ادھار چلا آتا تھا۔ حساب کر کے اس کا قرضہ چکایا اور آئندہ کے لیے اچاپت کو مطلقاً بند کر کے یہ قاعدہ باندھ دیا کہ جو چیز درکار ہو نقد بازار سے آجایا کرے۔

میر متقی بڑے بھانجے سید حاضر کو سمجھاتے ہیں کہ بہن کو محروم الارث مت کرو

غیرت بیگم کو بھائیوں نے ترکہ پدری سے محروم کر رکھا تھا۔ اور کس کی مجال تھی کہ ان بھڑوں کے چھتوں کو چھیڑے و داس بلا کے لوگ تھے کہ اگر ناش کی بھنگ بھی ان کے کان میں جا پڑتی۔ تو کہاں کے ماموں اور کس کی بہن اور کیسا بہنوئی سب کی عزت کے لاگو ہو جاتے۔ یہ ایک شعر جو مشہور ہے۔

بہر جا جمع سے آئند سادات

فسادات فسادات فسادات

کہتے ہیں کسی نے سید نگر والوں ہی کی شان میں کہا تھا اور متقی کو وہاں کے لوگوں کے ہتھکنڈے بخوبی معلوم تھے اور مخاصمانہ طور پر بھانجوں کے ساتھ پیش آنا اور ان کے مقابلے میں مدعی یا مدعا علیہ ہونا گو بھانجی ہی کا حق طلب کرنے کے لیے کیوں نہ ہو نہ ان کو شایان تھا اور نہ غیرت بیگم کے حق میں مفید۔ سید نگر کے سب لوگ زمیندار اور رعایا یہاں تک کہ خوش باش اور اس قدر مفید تھے کہ جموٹے بولنا جموٹا حلف اٹھالینا جموٹے گواد جموٹی رواد اور جموٹی دستاویزیں بنانا حاکم کو دھوکا پرایا حق مار بیٹھنا لوگوں کا ناحق ستانا ان باتوں کو بڑا ہنر اور داخل ہوشیاری سمجھتے تھے اور جس طرح کوئی بڑا نامی جنرل اپنے دوستوں میں فخر اپنی فتوحات کے واقعات کا بیان کرتا ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ دیوانی فوجداری کے مقدمات کے تذکرے کرتے رہتے تھے۔ کوئی امیر اپنی مدح پر اتنا ناز نہ کرتا ہوگا۔ جتنا ان کو ڈگریوں اور فیصلوں پر تھا، ان لوگوں کی نظروں میں میر متقی صوفی و فقیہ تھے۔ مگر سادہ لوح اور سفید عالم و فاضل تھے۔ مگر احمق و لاعقل، میر متقی کا چھوٹا بھانجا سید نگر ناظر جو غیرت بیگم سے بھی عمر میں چھوٹا تھا۔ کچھری دربار کا کام دیکھتا تھا۔ اور تمام معاملات مقدمات اسی سے متعلق تھے۔ پس یہ گھر کا عقل کل تھا، سید حاضر جو غیرت سے بڑا اور اکبر والا تھا۔ سید نگر میں مکان کی خبر گیری کرتا تھا اور رعایا سے وصول تحصیل کرنا اور سیراکا جتوانا بوانا غرض گاؤں کا سب کام کاغذ اس کے سپرد تھا، ماموں کا آنا سن کر سید نگر سے سید حاضر تو فوراً اگلے ہی دن آ حاضر ہوا اور اس نے اس کا بھی انتظار نہ کیا کہ تعزیت کے لیے ماموں کی طرف سے تقدیم ہوئی چاہئے۔ لیکن جب وہ واپس جانے لگا تو میر متقی اس کے ساتھ ادائے رسم تعزیت کے لیے سید نگر گئے۔ ناظر وہاں نہ تھا۔ معلوم نہیں کسی ضرورت سے غیر حاضر تھا۔ یا قصد اُماموں کی آمد سن کر ٹل گیا تھا۔ میر متقی نے تقریب تعزیت جہاں اور بہت سی باتیں سید حاضر سے کیں۔ ان میں سے یہ بھی تھی کہ تم کو شروع سے خدا نے بڑا کیا کیونکہ تم بھائی صاحب مرحوم کی اولاد میں سب سے بڑے



ہو لیکن تم پہلے صرف ان کی نسل میں بڑے تھے اور اب خاندان اور برادری میں بھی بڑے ہو کیونکہ تم کو لوگ مرحوم کا جانشین سمجھتے ہیں اور تم ان کے جانشین ہو بھی۔ انسان کو خدا نے ایسے طور کا مخلوق بنایا ہے کہ تمدن اس کو لازم ہے۔

جس طرح تمدن اس کے وجود کی شرط ہے کہ اگر انسان مدنی الطبع نہ ہوتے اور آدمی آدمی کے ساتھ مل کر نہ رہتا تو آگے کو ان کی نسل نہ جاتی۔ اسی طرح تمدن انسان کی حیات بلکہ اس کی ممات کی بھی شرط ہے تمدن نہ ہو تو انسان کی زندگی عذاب اور مرے پیچھے اس کی مٹی خراب، تمدن کی ضرورت سے آدمی دو دو چار چار دس دس پچاس پچاس ہزار ہزار لاکھ لاکھ اور اس سے بھی زیادہ زیادہ اکٹھے ہو کر رہتے ہیں اور خاندان اور قبیلے اور کنبے اور برادری اور گاؤں اور قصبے اور شہر اسی تمدن کے مظاہر ہیں۔ تمدن سے لوگوں میں انواع و اقسام کے باہمی تعلقات قائم ہوتے ہیں۔ ماں باپ بیٹا بیٹی میاں بی بی بھائی بہن اور جتنے طور کے دور و نزدیک کے رشتہ دار ہیں۔ اور ہمسایہ اور ہم وطن اور حاکم و محکوم اور بادشاہ اور رعایا اور استاد اور شاگرد اور آقا اور نوکر اور افسر اور ماتحت اور زمیندار اور کاشت کار اور بائع اور خریدار وغیرہ یہ سب نام ہیں لوگوں کے باہمی تعلقات کے ہر تعلق کے ساتھ کچھ حقوق ہوتے ہیں اور کچھ ذمہ داریاں مثلاً باپ اور بیٹے میں ایک طرح کا تعلق ہے باپ کا حق ہے کہ بیٹا اس کا ادب کرے۔ اس کا حکم مانے اور اس کی ذمہ داری یا عبارت دیگر اس کا فرض یہ ہے کہ بیٹے کو شفقت کے ساتھ پالے۔ تربیت کرے پڑھائے لکھائے بنر سکھائے جو اس کے کام آئے۔ لوگوں کا یہ حال ہے کہ تمدن کے حقوق اور فرائض میں اکثر بلکہ سب کے سب اللہ ماشاء اللہ مطغف میں مطغف عربی میں کہتے ہیں اس شخص کو کہ اپنا لینا ہو تو جھکی ہوئی تول لے اور دوسرے کا دینا ہو تو اڑتی ہوئی دے۔ ایسے ہی لوگوں کی شان میں اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔

افسوس ہے ڈنڈی ماروں پر کہ جب لوگوں سے تاپ کر لینا ہو تو پورا پورا لیں اور جب لوگوں کو تاپ کر یا تول کر دینا پڑے تو ان کو گھانا پہنچائیں۔ کیا لوگ اس بات کا خیال نہیں کرتے کہ ایک بڑا دن آنے والا ہے اور اس دن ان کو مر کر اٹھنا ہو گا۔ اس دن لوگ پروردگار عالم کے رو برو کھڑے ہوں گے۔ اسی طرح دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں اللہ ماشاء اللہ جو اپنے حق سے کسی بھائی کو رتی بھر چھوڑ دے۔ لینے میں تو ایسا سانا اور سخت گیر اور دوسرے کے حقوق ضائع ہوں۔ تلف ہوں کچھ پروا نہیں۔ ذرا دل پر میل نہیں دینے میں ایسا گھر کا بھولا اور شریر اور کش مکش اور مفسدے کے روکنے کے لیے اللہ صاحب جل شانہ نے دو ہرے دو ہرے انتظام کے لیے ایک سلطنت ظاہری کہ بادشاہ ہے اور اس کے پاس فوج ہے اور توپ ہے اور تلوار ہے اور قوت ہے اور پولیس ہے اور حاکموں کا ایک گروہ ہے اور جادہ ہے اور جیل خانہ ہے اور بند ہے اور تازیانہ ہے۔ اس انتظام کے تفصیلی حالات تم کو مجھ سے بہتر معلوم ہیں۔ دوسری ایک سلطنت الہی ہے جس کو دین یا مذہب یا شرع کہتے ہیں۔ اس میں توپ کا نام نہیں، تلوار کا کام نہیں۔ اعوان و انصار نہیں فوج اور سپاہ درکار نہیں۔ مگر دنیا میں جس قدر امن اور

جتنی عافیت ہے۔ اسی الہی سلطنت کی بدولت ہے۔ ظاہر میں اور کوتاہ میں ایسا سمجھتے ہیں کہ دنیا کا سارا انتظام حکام ظاہر کرتے ہیں۔ استغفر اللہ نہ کرتے ہیں نہ کر سکتے ہیں۔ ملک کی ساری پلٹنیں کا لوں کی اور گوروں کی اور سارے رسالے اور سارے توپ خانے اور سارے پولیس کے ملازم اور سارے حاکم سب کے مجموعے کو ملک کی مردم شماری پر پھیلا کر دیکھو۔ تو کیا پرتا سکتا ہے۔ اگرچہ دس ہزار باشندوں پر ایک کا پرتا بھی نہیں بیٹھے گا۔ مگر فرض کرو کہ دس ہزار پیچھے ایک تو کیا یہ بات سمجھ میں آنے کی ہے کہ ایک تنفس دس ہزار آدمی کے ضبط پر قادر ہو۔ آدمی تو آدمی اگر دس ہزار گدھے یا دس ہزار بھیڑ بکری بھی ہوں تو ایک چرواہا ان کو ایک جگہ کھڑا نہیں رکھ سکتا۔ نہ یہ کہ ان کو جس کروٹ اٹھائے انھیں اور جس کروٹ بٹھائے بیٹھیں ہاں شاید تمہارے دل میں یہ بات خطور کرے گی کہ حاکم ایک کو سزا دیتا ہے تو دس ہزار کو عبرت ہوتی۔ لیکن خیال کرنے کی بات ہے کہ جن کو سزا ہوئی انہیں کو کیا عبرت ہوئی کہ دوسروں کو ہوتی ہم نے تو یوں سنا ہے خدا جانے جموٹ یا تچ کہ بد معاش لوگ اول تو گرفت ہی میں نہیں آتے اور اگر کوئی شامت کا مارا فضا را ما خود بھی ہوا تو سید نگر والے (وکیل مختار) اس کو سزا نہیں ہونے دیتے اور سزا بھی ہوئی تو ان کو عبرت۔ اس سے ظاہر ہے کہ چھوٹے ہیں تو دوسرے قیدیوں کو وصیت کر آتے ہیں کہ دیکھنا بھائی میرے چولہے کو باتھ نہ لگانا مہینہ پورا نہیں ہونے پائے گا کہ میں پھر آتا ہوں۔ ہم کو تو کبھی اتفاق نہیں ہوا اور خدا نہ کرے کہ ہو مگر اخباروں میں اکثر دیکھنا ہے کہ فلاں مقام پر فلاں خونی کو فلاں تاریخ فلاں وقت پھانسی دی گئی۔ دو ہزار آدمیوں کی بھیڑ تھی۔ عبرت ہو تو ایسی ہو۔ یہ سب نا لائق تماشا تھے اور سنگ دل قصائی اس کے علاوہ ایک بد یہی دیبل ایسی ہے کہ اس سے تو تم کو میری بات کا پورا یقین ہو جائے گا۔ یہ بلو اہا جو بیلوں کو تھان سے کھول کر لے جا رہا تھا۔ اس کا کیا نام ہے؟

حاضر: اس کا نام غریبا

منقی: ذرا اس کو بلانا

حاضر: نے بلایا تو اس نے بل تو کندھے پر اتار کر وہیں رکھ دیا اور اسی بل سے بیلوں کو انکا سامنے آ کھڑا ہوا۔

منقی: کیوں میاں تمہارا کیا نام ہے۔

غریبا: میاں مجھ کو گریبا کہتے ہیں۔

منقی: کون ذات ہو۔

غریبا: گوجرنا

منقی: تم تنقی بھیجتی کرتے ہو؟

غریبا: میری کھیتی الگ نہیں (سید حاضر کی طرف اشارہ کر کے) ہاجر (حاضر) میاں کابلو ابا ہوں اور کھار میں ایک دو بیگھے  
کا کھیت بھو مالو نیسے کا بنے۔ اس میں ادھواڑ کا بانڈیہ دار سنبوں۔

منقی: بال بچے کتنے ہیں

غریبا: (مسکرا کر) بھگوان کی بڑی کرپا بنے۔ آٹھ۔

منقی: کسی کا بیادرات بھی کی بنے۔

غریبا: ابھی سب نیدان سگیں۔

منقی: اتنے کنبے میں کیوں کر گزرتی ہوگی۔

غریبا: ہاجر (حاضر) میاں کی دیا سے روکھی سوکھی، ایسی کشی دو وخت نہیں تو ایک وخت مل ہی جاتی بنے۔ چھوٹے بڑے انہی  
کی ٹہل میں لگے رہتے ہیں۔ یہی سب کو پالتے ہیں بھیت سے بڑی سہایتا رہتی بنے۔

منقی: اشارے سے غریبا کو پاس بلا کر (آہستہ سے) کیوں بے آج کل تو کھلیاں تیار ہیں۔ رات بے رات مونتق پا کر  
کھلیاں پیچھے دو دو پولی بھی اٹھا لائے تو کسی کو کیا معلوم اور مزے میں تیرا کام ہو جائے۔

غریبا: (دور ہٹ کر) نامیاں بھگوان برا کام نہ کرائے۔

منقی: کیوں کیا جا گا چوکیدار سے ڈرتا بنے۔ اس کو ہم سمجھا دیں گے۔

غریبا: جا گا (گالی) کہاں کا سورما بنے۔ ایک ڈپٹ بناؤں تو (گالی) دو ہوتی ہیں۔۔۔ پر نہیں برا کام برا ہی بنے۔

منقی: ابے مخرے کسی کو کانوں کان تو خبر ہونے کی نہیں، یہ اچھا بنے کہ تن پر چیتھڑا نہیں، پیٹ کو کھڑا نہیں۔

غریبا: مانس شہر پڑامت دیکھو بھگوان سے تو کچھ چھپائیں۔

اس کے بعد منقی نے استمالت کی دو چار باتیں کر کے غریبا کو تو رخصت کیا اور سید حاضر سے کہا۔ کیوں صاحب آپ نے

دیکھا یہی انتظام الہی بنے کہ یہ بے چارہ نہ تو پڑھا اور نہ لکھا اور نہ شاید ساری عمر کسی پنڈت، برہمن کی صحبت میں بیٹھا۔

ضرورت اس درجے کی کہ اگر سچ سچ پوچھئے تو فن<sup>۱</sup> ضرطرفی مخمصہ کا مصداق بن اندیشہ پاسباں سے مطمئن اور

اس پر چوری کو سمجھتا بنے کہ برا کام بنے۔ اصل میں برا سمجھنا اس کو چوری کے ارتکاب کا مان بنے اور یہ سمجھ یعنی برے بھلے کا

اتیاز جو خدا نے مرد عورت لڑکے جوان، بوڑھے خواندہ تا خواندہ ذہین، غنی شہری دیہاتی سے بنی آدم کو اعلیٰ قدر مراتب دیا

بنے۔ ایک پاسبان الہی بنے جو ہر ایک پر مسلط بنے اس کو کراما کاتین کے کہو یا نفس<sup>۲</sup> لوامہ سمجھو یا جن الفاظ سے چاہو تم میر

کرو میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ جرموں کا انسداد لاکھ حصے سلطنت الہی کی تاثیر سے ہے تو شاید ایک حصے حکومت ظاہری کی تدبیر سے حکومت ظاہری میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ حاکم کیسا ہی منصف کیوں نہ ہو چونکہ اس کو معاملے کی اصل حقیقت سے تو آگاہی ہوتی نہیں۔ ناچار اسے روداد کی پابندی کرنی پڑتی ہے اور روداد کی کیفیت تو کوئی ہمارے سیدنگری بھائیوں سے پوچھے کہ کہہ تو مکھی کو ہمیں سنا بنا دیں اور فرماؤ تو بھینسے کو چھڑنا کراڑ دیں۔ پس حاکم ظاہری کبھی پورا پورا انصاف کر ہی نہیں سکتا۔ اس کا فیصلہ اندھے کی اٹھی ہے۔ لگی لگی نہ لگی نہ لگی برخلاف سلطنت الہی کے اس کا نشانہ ممکن نہیں کہ خطا کرے۔ اس کا مجرم ہو نہیں سکتا کہ سزا سے بچ جائے کسی کی مجال ہے کہ اس کی ڈگری کو روکے کس کی طاقت ہے کہ اس کے حکم کو ٹالے اگرچہ خدائی فیصلوں کے لیے ایک دن مقرر ہے۔ یعنی روز قیامت کے اس دن اللہ جل و علا شانہ عدل و انصاف کے تحت پر اجاں فرمائے گا اور نیک اور بد اور نیک اور شوم اور ظالم اور مظلوم سب کا اخیر چکوتا کر دے گا۔ فریق فی الجنۃ و فریق فی السعیر مگر کبھی مصلحت الہی اس کی بھی مفتضی ہوتی ہے کہ اس دنیا میں بدل مل جاتا ہے۔ یہی سیدنگر ہے کہ اب سے بہت زیادہ دور بھی نہیں۔ شاید بیس برس پہلے دس بارہ ہاتھی سادات کے دروازوں پر کھڑے جموتے تھے۔ اور ان کی سخاوت اور داد و بخشش اور مہمان نوازی اور مسافر پروری کی کیا شہرت تھی کہ کربلا اور بغداد اور حرمین اور نجف اور کائناتیں تک زوار ہر سال نام سن کر آتے تھے۔ میں ان دنوں اچھا خاصا بوشیار تھا۔ مجھ کو اب تک یاد ہے کہ اس بڑی مسجد میں دو ڈھائی سو طالب علم رہتے تھے۔ اور یہیں کے سادات ان کے کھانے پکڑے کتاب سے چیزوں کی خبر گیری کرتے تھے۔ طالب علموں کو پڑھانے کے لیے بیش قرار تنخواہوں کے پانچ یا چھ اچھے جید حافظ اور مولوی نوکر تھے۔ سارے مہینے رمضان کے اور دس دن محرم کے غربا اور مساکین کے لیے اس قدر کھانے پکتے تھے کہ اس کا ٹھیک اندازہ کرنا مشکل ہے۔ بارہ کوس کے گردے کی تمام خلقت ٹوٹتی تھی اور کیا نیتوں کی برکت تھی کہ ہزار دو ہزار پانچ ہزار جتنے آدمی ہوتے ہر شخص کو دو نمیری روٹیاں ایک پیالہ قلبے کا اور ایک نوانچہ کھیر کا وقت پر پہنچ جاتا۔ میرا بابا صاحب کا گھرانہ دنوں سب سے بڑا حاجہ ہوا تھا۔ ان کا حال سنا ہے کہ ان دنوں وقت گئے ہوئے پورے سو آدمی دسترخوان پر میر صاحب کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ اور کسی خدا کی مہربانی تھی کہ گلی میں دیکھو تو کوڑیوں لڑکے سیدنگر میں کبھی کسی سیدانی کو پانچ اور چھ سے کم کسی کے بچے سننے میں نہیں آئے۔ غلہ ہمیشہ ارزاں عام بیماری یا وبا کبھی سیدنگر کے سوانے میں داخل نہیں ہوئی۔ یکا یک گوجروں سے سوانے کی تکرار ہوئی لٹھ چاٹنے سے آدمی مارے گئے۔ بس اس دن سے سیدنگر پر تباہی آئی۔ یوں تو سادات اور گوجروں میں سدا سے ہی چھیڑ چھاڑ ہوتی ہی چلی آتی تھی۔ مگر اس مقدمے میں سادات سر اسر برسرنا حق تھے۔ ہمیشہ سے سیدنگر کا سوانا اس تیس ہزاری بانگ کی مشرقی کھائی تھی۔ یہ بانگ عین سوانے پر اسی غرض سے لگایا گیا تھا کہ گوجر حد سے متجاوز نہ ہوں۔ تکرار

اتنی ذرا سی بات پر ہوئی کہ میر بابا کے بڑے بیٹے میر مقتدر کے سائیسوں نے گوجروں کی رکھانت گھانٹس بانگ کے پورب کاٹنی شروع کی۔ گوجروں نے مزاحمت کی۔ یہاں تک داتا سنگ نے جو گوجروں کا سرگرد اور میر بابا کا مد مقابل تھا۔ اپنا خاص کارندہ میر بابا کے پاس بھیجا۔ وہ کارندہ میر صاحب تک پہنچنے نہیں پایا کہ بیچ میں میر مقتدر نے اس کو بہت کچھ سخت ست کہا اور حق و ناحق ہزار ہا گالیاں داتا سنگ کو دیں۔ میر مقتدر بڑے غصیلے اور بڑے ظالم اور بڑے سخت گیر اور بڑے جابر مشہور تھے۔ کہتے ہیں کہ دو تین خون ان کے ہاتھ سے ہوئے۔ گردب دبا گئے۔ انہوں نے ظلم کئی بھلے آدمیوں کی ناموس بگاڑی اور عزت ریزی کی۔ میر بابا کے خاندان میں جو سید لوگ ناتانہیں کرتے اصل میں اس کا سبب یہی ہے کہ میر مقتدر نے بلا امتیاز بہت سی عورتوں کو ناتا جبراً گھر میں ڈال لیا تھا۔ کوئی ہندنی تھی کوئی چماری کوئی گوجرنی غرض میر مقتدر کے بعد سے ان کے خاندان کے نسب کا اعتبار اٹھ گیا۔ بیٹے کے زور و ظلم نے میر بابا کی تمام نیکیوں کو بے قدر کر رکھا تھا، نہیں معلوم دیدہ و دانستہ بیٹے کی حرکات و سوانح سے چشم پوشی کرتے تھے یا واقعہ مقتدر پر ان کا کچھ اقتدار نہ تھا۔ میر مقتدر کا تمام علاقے میں ایسا زلزلہ تھا کہ کوئی بھلا آدمی سید نگر کی تھانہ داری پر آنے کے لیے رضامند نہیں ہوتا تھا۔ مجبور کیا جاتا تو نوکری سے استعفیٰ دیتا مگر ادھر کا رخ نہ کرتا۔ میں ایسا خیال کرتا ہوں کہ سید نگر کو مقتدر کے ظلموں نے بتا دیا اور نزاغہ سوانے کا ایک بہانہ تھا۔ جب مقتدر نے داتا سنگ کے کارندے کو برا بھلا کہا اور اس کے مالک کے غلے رؤس الا شہادہ مغالطہ سنائیں وہ بے چارہ اپنا سامنہ لے لے لوٹ گیا۔ اور داتا سنگ کے آگے جا کر اپنی پگڑی زمین پر دے ماری اور کہا کہ تم نے مجھ کو بے عزت کرایا اور خود بھی بے عزت ہوئے۔ آج میر بابا کے بیٹے نے بھری کچہری میں مجھ کو اور تم دونوں کو فضاخت کیا اور ایسی ایسی گالیاں دیں کہ کوئی چمار کو بھی نہیں دیتا۔ داتا سنگ بڑی غیرت اور طنطنے کا آدمی تھا اور کسی بات سے میر بابا سے پیٹا نہ تھا۔ سن کر اہل ہو گیا اور کہا کہ اس مسلمان کے چھو کرے کا اتنا مقدور خیراب لڑائی نہ تو لڑائی سہی، داتا سنگ کے منہ سے اتنی بات کا ٹکنا تھا کہ ڈیڑھ دو ہزار گوجر بھاری بھاری اٹھ کندھوں پر دھڑ رکھانت پر جامو جو دو ہوئے۔ میر صاحب کے گھسیارے ان کو دور سے دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ سید نگر میں خبر ہوئی۔ ادھر سے لشکر۔ مادات نکالا دو پہر کامل اٹھ چا دوپونے دو سو آدمی زخمی ہوئے چار گھڑی رات جاتے جاتے سرکاری فوج توپ لے کر آ پہنچی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی۔ تحقیقات ہونے لگی اور نتیجہ یہ ہوا۔

		قید
--	--	-----

دائم الحبس	میعادی	
۵	۵۱	۷
۲۲۰	۱۰۱	۱۸

ہنگاموں اور خانہ جنگیوں میں اکثر سزا کا پلہ دونوں طرف برابر رہتا ہے۔ مگر سیدوں نے بڑا غضب یہ کیا کہ ادھر تو سوانے پر لڑائی ہو رہی تھی، اور ڈھائی تین سو آدمی سید نگر سے نکل کئی کاٹ گوجر پور میں جا گئے۔ اور وہاں گوجروں کے مندروں کو توڑا پھوڑا، عورتوں کو بے عزت کیا۔ مگر یوں سیدوں کی طرف سے زیادتی بہت ہوئی اور سزا بھی بہتوں نے پائی۔ میر بابا نے تو جس وقت سرکاری فوج کا آنا سنا اسی وقت زہر کھا کر مر رہے۔ میر مقتدر کسی تدبیر سے بھاگ نکلے گھر بار ضبط ہوا اسباب نیا م ہوا، بیٹوں میں تین یا چار نابالغ تھے وہ تو بچے، دو نے پھانسی پائی اور دو کا لے پانی نیچے گئے میر مقتدر کے لیے پانسو روپے کا اشتہار ہوا مگر پکڑے نہ گئے۔ رفیق ان کا ایک خانہ پروردان کے ساتھ بھاگا۔ دس بار درس بعد اکیلا واپس آیا بڑا نمازی پرہیزگار و دیوانہ کرتا تھا ان کی مصیبتیں کہ سن کر رو گئے کھڑے ہوتے، کہتا تھا کہ آخر کار کسی مقام پر بغداد کے علاقے میں میر مقتدر مرض موت میں مبتلا ہوئے۔ مگر ایسی سختی کی موت ہم نے تو دیکھی کیا سنی بھی نہیں پورے پندرہ دن بول و براز بند تھا نہ مسہل اثر کرتا تھا نہ حقنا نہ پچکاری اور دن اور رات چھلی کی طرح تڑپتے تھے۔ اور کسی وقت تالو سے زبان نہیں لگتی تھی۔ بول و براز کے بند ہونے سے مادے میں سمیت پیدا ہوئی اور سمیت ظاہر جلد تک پھوٹ پڑی، باوجودیکہ نہایت گورے چمے آدمی تھے اور ان مصیبتوں میں بھی ایرانی معلوم ہوتے تھے۔ سمیت کی وجہ سے سارا جسم ایسا ہو گیا تھا جیسے سیتاب اور سوزش اس بلا کی کہ کچھ میں اونٹوں نے پھرتے تھے۔ مگر ایک لمحہ قرار نہ تھا۔ مرنے سے سات دن پہلے نہیں معلوم کیا بات تھی۔ بے ہوشی میں وطن کے لوگوں کے نام لے لے کر کہتے تھے فلاں مجھ کو مارے ڈالتا ہے۔ فلاں گرم سیخیں میرے پیٹ میں بھونکتا ہے۔ فلاں مجھ کو تنور میں دھکا دیتا ہے۔ فلاں میری کھال کھینچتا ہے۔ رفیق یہ دیکھ کر اس قدر مرعوب ہوا کہ گویا اسی دن سے اس نے ترک دنیا کیا۔ غرض وہ کم بخت سوانے کا مقدمہ کیا ہوا تھا کہ سید نگر کے حصے کی قیامت آگئی۔ آبرو اور جان اور مال کا جو نقصان ہوا تھا سو ہوا تھا۔ ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ۔ مادات سے خیر بالکل اٹھ گئی۔ اب اس میں نواح میں سید کے معنے ہیں مفسد لڑاکا جھگڑا، مردم آزار، جھوٹا جلسا، منفردی، فتنہ پرداز اور واقع میں لوگوں کے افعال اور معاملات پر نظر کرتے ہیں تو جس قدر بدنامی ہو رہی ہے۔ اس سے زیادہ کے مستحق ہیں۔ گوجروں کے ساتھ لڑنے کا مزد چکھ چکے تھے۔ چاہیے تھا کہ لڑائی کے پاس نہ پھسکتے مگر الٹا اثر یہ دیکھنے میں آیا کہ بھائی سے بھائی لڑنے لگا، باپ بیٹے سے بیٹا ماں سے، میاں بیوی سے، پڑوسی پڑوسی سے، حصہ دار حصہ دار سے، زمیندار کا شکار سے گویا لڑائی ان کے

خیر میں داخل ہے۔ یا بے لڑے ان کو نیند نہیں آتی یا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ شرافت نجات کے دعوے اتنے لمبے چوڑے کہ کسی کو اپنا کفو نہیں سمجھتے مگر معاملات ایسے کہ پاجی سے پاجی کو شرم آئے اور کمینے سے کمینے کو عار۔ سیدنگر کی کھیوٹ نکال کر دیکھو جھڑا عورتوں کے نام ہیں کسی کی جو رو کسی کی بیٹی، کسی کی بہن۔ دیوانی و فوجداری میں مہر اور نان و نفقہ اور طلاق کے جتنے مقدمے ایک سیدنگر کے ہوں گے۔ شاید ساری لٹیفنی کے نہ ہوں۔ مگر ان تمام فسادات کے نتیجے کیا ہیں۔ تم لوگوں کے گھروں میں اسٹامپ کے بڑے بڑے پشتارے بہت نکلیں گے۔ بیبیوں کے جسم پر چاندی کا تار نہیں، باوجودیکہ دیہاتی پہناوا ہے۔ گکھڑی میں سیلے کا کوئی کپڑا نہیں جو راجا ساناواں کردوں جو کچھ سیر میں پیدا ہوا اسی پر تمہاری گزران ہے۔ تمہارا علاقہ شہد کی مکھیوں کا چھتا ہے۔ جتنے پیدا ہوتے گئے۔ اسی میں بھرتے گئے۔ میں اگر تمہارے علاقے کا مہتمم بندوبست ہوتا بیگاہ بسوانسی کچوانسی سب موقوف کر کے کسور اعتشاریہ میں تمہارا کھیوٹ بناتا۔ یہ حال تمہاری حصہ داریوں کا ہو گیا ہے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ جس حصے کو دیکھیے کثرت سے انتقالات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک کباب ہے اور اس میں ہزار ہا چوبیونیاں۔ سیدزادوں کو دیکھا تو اس سرے تک ایک ہوشیار نہیں کسی میں آئندہ کی فلاح کے آثار نہیں۔ یہ وہاں کہ نکتہ یہ ذلت یہ افلاس سب تمہارے ہی اعمال کی سزا ہے اور اگر یہ پوری سزا ہوتی تو تم سستے چھوٹ گئے تھے۔ یقیناً جانوسزائیں نہ بلکہ تمہید سزا۔ جب سزا کا وقت آئے گا۔ تو یہ تمہارا قانون اور قاعدہ کچھ نہیں پوچھا جائے گا۔ حقوق کے متعلق ایک بات اور ہے۔ جس کو میں چاہتا ہوں کہ تم اس کی طرف زیادہ توجہ کرو وہ یہ ہے کہ انسان کے ذمہ دو طرح کے حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ لوگ حقوق العباد کی نسبت بڑی غلطی میں پڑے ہیں اور ان کو آسان سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ اگر کسی آدمی سے اللہ کے حقوق ضائع ہوں اور سبھی سے ہوتے ہیں۔ تو بندے کا خدا سے کیا مقابلہ، حقوق الہی کا زیاں اکثر سہو اور غفلت اور نادانی اور کوتاہ اندیشی کی وجہ سے ہوتا ہے اور امید ہے کہ خداوند غفور و رحیم بندوں کے ضعف پر نظر فرما کر ان کے قصور معاف کرے اور کرے گا، مگر حقوق العباد کا یہ حال نہیں ہے۔ اس میں ایک بندہ زور سے، ظلم سے، ہیکڑی سے، زبردستی سے دوسرے بندے کو ستاتا، اس کا دل دکھاتا، اس کو ایذا پہنچاتا ہے۔ اور اس قصور کا معاف کرنا نہ کرنا۔ اس بندہ مظلوم کے اختیار میں ہے۔ مگر انصاف کرو۔ دنیا میں کتنے لوگ اس کی پرواہ کرتے ہیں۔ انہوں نے مظلوم ہیں جن کو بندگان خدا مارتے وقت اپنے سروں پر لاد کر لے جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ دین کو کھیل اور مذہب کو ہنسی سمجھ رکھا ہے۔ منہ سے کہتے ہیں کہ مرنا برحق نکیریں کے ساتھ سوال و جواب کا ہونا برحق، عذاب قبر برحق، قیامت برحق، مرے بعد پھر زندہ ہونا برحق، رتی رتی کا حساب دینا برحق، جنت برحق، دوزخ برحق، اور کردار برحق، تھوٹ سید حاضر مجھ میں تم میں قرابت کا

ایک تعلق ہے۔ اور جیسا میں نے تم سے کہا تعلق سے پیدا ہوتے ہیں حقوق اور فرائض میں اس کو اپنا فرض تعلق سمجھتا تھا کہ تمہارے فرائض کو تم پر بالا جمال ظاہر کردوں سو میں نے اپنا فرض ادا کیا۔

یہ کہہ کر منتقی بھانجے سے رخصت ہوا اور چلتے چلتے کہہ گیا کہ افسوس ہے سیدنا نظر سے ملاقات نہ ہوئی انشاء اللہ پھر کسی دن آؤں گا۔ میرا منتقی نے اچھے خاصے پہرہ پہرہ سیدنا حاضر کے ساتھ باتیں کیں اس تمام وقت میں سیدنا حاضر کا یہ حال تھا کہ ماموں کے منہ پر اس کی عملی بندھی ہوئی تھی اور ہمہ تن گوش ہو کر ان کی باتوں میں مستغرق تھا جو لفظ ماموں کے منہ سے نکلتا اس کے دل میں کانٹشش فی الجبر بیٹھتا چلا جاتا۔ حاضر کے کان مطلقاً ایسی باتوں سے آشنا نہ تھے اس پر میرا منتقی کا بیان گویا ایک دریا ہے کہ موجیں مار رہا ہے یا ریل ہے کہ فی گھنٹا سو میل کی رفتار سے دوڑ رہی ہے یا بھری برسات میں ساون بھادوں کا بادل ہے کہ اٹھ چلا آ رہا ہے۔ اور پھر باتیں کھری سچی ستھری جن میں ذرا اونچ نیچ نہیں دنیا کے فائدوں کے ضامن دین کی درستی کی کفیل بھلائی کی اصلاح بہتری کا مشورہ سیدنا حاضر بت کی طرح چپ بیٹھا سنتا رہا۔ اگرچہ گاؤں کا کام کاج کرتا تھا مگر کونسا گاؤں سیدنا جہاں کے پرچوینے سا ہو کاروں کے شکمی کا شتکار تعلق داروں کے جاہل محض لیاقت شعاروں کے اہل مقدمہ وکیل مختاروں کے کان کترتے تھے مگر منتقی نے اتنا کچھ کہا اور سیدنا حاضر سے چوں کرتے نہ بن پڑی۔



سید حاضر کا میر تقی کے وعظ سے متاثر اور متنبہ ہو کر بہن کو اس کا حق دینے پر آمادہ ہونا اور دونوں بھائیوں کی اسی بات پر باہمی رنجش

میر تقی کے چلے جانے کے بعد بھی سید حاضر دیر تک سکتے کے عالم میں تھا اپنے یہاں کے معاملات میں سے جس پر نظر کرتا تھا کسی کو دخل فساد سے اتنا فحقوق العباد سے خالی نہیں پاتا تھا۔ جن باتوں پر اس کو بڑا ناز تھا۔ اب اس کی نظر میں نہایت ذلیل اور پاجی پن کی ذیل معلوم ہوتی تھیں۔ وہ گھبرایا ہوا دالان میں ٹہل رہا تھا اور اس قدر بے قرار تھا کہ جاڑے کے دن اور شام کے وقت اس کو پسینے پر پسینے چلے آتے تھے اور دیکھتا تھا کہ کھانا اور پینا اور اوڑھنا اور بچھونا اور ساز و سامان اور مال و متاع اور نقد و جنس کہ اپنا گوشت پوست کوئی چیز بھی اوش حرمت سے پاک نہیں پاتا تھا کہ بد کرداری اور بد معا ملگی ہماری برادری اور ہمارے خاندان میں ابامن جدا۔ چلی آتی ہے۔ اگرچہ حاضر و ناضر دونوں باپ کے مرنے سے معاملات کرنے لگے تھے مگر حاضر نے احتساب کیا تو اتنے ہی دنوں میں صد مظلمیہ ان کے نامہ اعمال پر چڑھ چکے تھے۔ اور ان میں اکثر ایسے تھے جن کا تذکرہ محال تھا اور تلافی ناممکن۔ ہم کو حاضر کی اتنی بات سے تعلق ہے کہ جہاں اس کو اپنے وقت کے اور بہت سے معاملے یاد آئے ان میں سے ایک معاملہ غیرت نیگم کا تھا۔ اگرچہ غیرت نیگم کے معاملے میں ابتداء تحریک ناظر کی طرف سے ہوئی اور کسی کو اس میں زیادہ اصرار بھی نہ تھا مگر پھر حاضر کا اتنا قصور تو تھا ہی کہ بڑا بھائی ہو کر اس نے ناظر کو سمجھایا نہیں۔ غیرت نیگم کا خیال آنا تھا کہ فو را گھوڑا کسو اسوار ہو کر راتوں رات شہر میں ناظر کے مکان پر جا دستک دی۔ اگلے دن کسی مقدمے کی پیشی تھی اور ناظر آدمی رات تک گواہوں کی تعلیم اور کاغذات کی درستی میں مصروف تھا۔ ابھی اچھی طرح نیند بھری ہی نہ تھی کہ بھائی کی آواز سن کر چونک پڑا اور لگا پوچھنے۔

ناظر: خیر تو بے آپ ایسے سویرے کیوکر آئے۔

حاضر: خیر نہ تم باطمینان وقتی ضرورتوں سے فارغ ہو لو تو میں اپنے آنے کی وجہ بیان کروں۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تھوڑی دیر بعد جب دونوں بھائی یک جا ہوئے تو حاضر نے پوچھا ”چھوٹے ماموں آئے ہیں تم ان سے ملے۔“ ناظر: ماموں کا آنا تو مجھے معلوم ہوا مگر میں ملا نہیں اور ملنے کا ارادہ بھی نہیں۔

حاضر: کیوں

ناظر: میں جانتا ہوں کہ وہ آپ کا جھگڑا ضرور نکالیں گے۔ اور مجھ کو کسی طرح آپ کا حصہ دینا منظور نہیں ہے فائدوں باتوں ہی باتوں میں تکرار ہو پڑے گی۔

حاضر: کیوں بے چاری غیرت نے ایسا تصور کیا کیا ہے، کیا وہ ہماری حقیقی بہن اور متروکہ پدری میں عند اللہ اور عند الرسول حقدار نہیں ہے۔

حاضر کے منہ سے یہ سوال سن کر ناظر کے کان کھڑے ہو گئے۔ آدمی تھا معاملہ فہم معاملہ شناس فوراً تازہ گیا کہ بھائی ماموں سے ملے اور ماموں نے پٹی پڑھائی۔ تو کہتا کیا ہے کہ

ناظر: اگر ماموں کوئی فتویٰ ملے سے لکھوا کر لائے ہوں تو اس کو اپنی قدوری سہ میں چپکا رکھیں ان کو شاید یہ معلوم نہ ہو گا کہ یہاں شریف مکہ کا حکم نہیں چلتا انگریز بہادر کی عمل داری ہے میں نے برسوں کی جستجو میں پریوی کونسل اور عدالت ہائے عالیہ ہائی کورٹ اور چیف کورٹ اور جوڈیشل کمشنر کے فیصلوں اور میکانٹن سرہنری الا کی شرع محمدی سے وہ وہ نظائر اور احکام چھانٹ رکھے ہیں کہ اگر آپ اسے جہیز واپس نہ کراؤں تو سید نہیں چمار۔

حاضر کو بھی بھائی کی اس قد رخشونت سہ دیکھ کر نہایت استعجاب لکھوا کیونکہ اس نے آج تک حاضر کے رو در رو ایسی شوخ چٹشی کے ساتھ کبھی بات نہیں کی تھی اور بولا کہ

حاضر: تم ماموں سے ناحق بدگمان ہوتے ہو میں ان سے ملا بے شک اور وہ تعزیت کے لیے سید مگر تشریف لے گئے بلاشبہ مگر غیرت بیگم کا نام تک ان بے چارے نے نہیں لیا اور افسوس ہے کہ تم نے ان کی شان میں خورد ہو کر اس قدر گستاخی کی اور وہ بھی غائبانہ پس تم نے ایک بزرگ کا حق تلف کیا۔

ناظر: انہوں نے آپ کا نام نہ لیا ہو گا الکنساتہ ابلخ حسن الصراحتہ اور فرض کیا میں نے گستاخی کی تو قانون نے صرف ایک ہی گستاخی کو جرم قرار دیا ہے یعنی حکم عدالت کے ساتھ گستاخی کرنا جب کہ وہ عدالت کا اجلاس کر رہا ہو اور ظاہر ہے کہ ماموں اس کے مصداق نہیں ہو سکتے۔

ناظر کے اس جواب سے حاضر کو سید متقی کی اس بات کی تصدیق ہوئی کہ حکام ظاہر کے انتظام سے پورے طور حقوق العباد کی حفاظت نہیں ہو سکتی۔ سید متقی کے وعظ سے سید حاضر کے خیالات دفعتاً اس قدر متبدل ہو گئے تھے کہ دونوں بھائیوں میں التیام کا ہونا محال تھا۔ ناظر اپنے اس پرانے موروثی ڈھرے چلتا تھا کہ قانونی گرفت بچا کر جہاں تک اور جس طرح ممکن ہوا اپنا فائدہ کرنا چاہیے۔ کسی کا حق تلف ہو تو مضائقہ نہیں، کسی کا دل دکھے تو پروا نہیں، عاقبت تباہ ہو تو کچھ

حرف نہیں اور سید حاضر کو اب اس بلا کا اہتمام تھا کہ ایک غیبت کو بھی دو اتاناف حق سمجھا، غرض یہ جو سنا کرتے تھے کہ الدنیا والدین ضرر تان ۱

ہم خدا خواہی وہم دنیاۓ دوں  
ایں خیال ست و محال ست و جنوں

اب وہ معمہ حل ہوا کہ حقیقت میں وہ یہ دنیا ہے کہ جیسی ناظر کی تھی جس میں حلال و حرام کا امتیاز نہیں جائز و ناجائز کا فرق نہیں خدا و رسول کا خوف نہیں روز قیامت کا اندیشہ نہیں۔ ناظر کی اتنی ہی باتوں سے حاضر کو پورا یقین ہو گیا کہ اس کو سمجھانا یا اس کے ساتھ بحث کرنا محض بے سود اور لا حاصل ہے۔ اس پر قانون کی پھٹکار ہے اور اس کے سر پر چڑھا ہوا جن سوار ہے۔ اس لیے زیادہ رو کو کم مناسب نہ سمجھ کر اس نے دو ٹوک بات ناظر کو سنادی کہ تم اس کو ماموں کا اغوا سمجھو یا میرا حق میں تو غیرت بیگم کا حق اب ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رکھ سکتا۔

ناظر: دیکھئے ایسا کیجئے گا تو مجھ سے آپ سے بگاڑ ہو جائے گا

حاضر: اگر اتنی ہی بات پر کہ میں ایک حقدار کا حق مارنا نہیں چاہتا تم مجھ سے بگڑو تو تمہاری خوشی اگر چہ تمہارے بگڑنے کا مجھے سخت افسوس ہو گا مگر اس سے ہزار درجے زیادہ افسوس ہو گا اگر غیرت بیگم کا حق غصہ بامیر سے پاس رہے۔ ناظر: یہ آپ کی خصوصیت کیا ہے۔

حاضر: خصوصیت پوچھو تو میری حقیقی بہن ہے۔ مگر ایصال حق کے لیے اس کی مطلق خصوصیت نہیں انشاء اللہ سب حق داروں کے ساتھ میں ایسا ہی معاملہ کروں گا۔

ناظر: تو آپ سیدھی بات یہی کیوں نہیں کہتے کہ آپ ترک دنیا پر آمادہ ہیں۔

حاضر: اگر مغصوبات کا واپس کر دینا تمہارے نزدیک ترک دنیا ہے تو مجھے اس سے انکار نہیں۔

ناظر: بیٹھے بیٹھائے یہ آپ کو ہوا کیا ہے پہلے تو میں ماموں کو موٹوای حاجی اور جیسماں کا نام ہے منقہ سمجھتا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ تنخیر یا سحر کے بھی عامل ہیں۔

حاضر: ماموں کی شان میں تمہاری طرف سے یہ دوسری گستاخی اور دوسری غیبت اور دوسرا اتاناف حق ہے۔

ناظر: میں آپ کو آگاہ کیئے دیتا ہوں کہ یہ گھر کی تباہی کے سامان ہیں۔

حاضر: جس گھر کی آبادی دوسروں کے حقوق غصب کرنے پر موقوف ہو اس کا تباہ کرنا بہتر ہے۔

ناظر: تم نے انجام کار پر بھی نظر کر لی ہے۔

حاضر: انجام کار پر نظر کرنا ہی مجھ کو تو اس ارادے کا باعث ہوا ہے۔

ناظر: تو آپ مجھ کو بھی اپنے ساتھ برباد کرتے ہیں، کیسی کیسی تدبیروں سے میں نے ملکیت کو درست کیا۔ اب ایک ڈھنگ پر آ چلی تھی تو آپ ساری عمارت کو جڑ بنیاد سے ڈھائے دیتے ہیں۔

حاضر: کیا تم نے مجھ کو مجنوں قرار دیا ہے یا مجبوظ الحواس سمجھا ہے۔ دنیا میں کوئی شخص بھی ایسا ہے جو دیدہ دانستہ اپنے پاؤں میں آپ کلباڑی مارے یا سمجھ بوجھ کر اپنے رہنے کے مکان میں آپ آگ لگائے، فرق اتنا ہی ہے کہ اس بات کا میں نے قطعی فیصلہ کر لیا ہے کہ دنیا کو دین پر ترجیح نہ دوں اور جس دنیاوی فائدے میں دین کا ضرر ہے اس کی طمع نہ کروں۔ اگر ایسا کرنے سے میری دنیا برباد ہوتی ہو اور اگر مجھ پر دنیاوی تباہی آتی ہو تو آئے۔ جب میں نے دین کے خلاف دنیاوی فائدے کا لالچ نہ کیا تو دنیاوی نقصان میں کیا پرواہ کر سکتا ہوں۔“ ناظر میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میں تمہارے فائدے کو بہت ہی عزیز رکھتا ہوں مگر وہیں تک کہ وہ فائدے جائز طور پر حاصل کئے جائیں غصب اور ظلم اور دغا اور فساد اور اتنا ف حقوق العباد کو نہ میں اپنے لیے جائز رکھتا ہوں اور نہ تمہارے لیے۔

ناظر: یہی تو میں کہتا ہوں کہ آپ پر ماموں نے جادو کیا۔

حاضر: اگر تمہارے نزدیک یہ جادو تو ہے تو یہی جادو تمام پیغمبر صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہم اجمعین تمام اولیاء تمام انبیاء تمام تقیاء کرتے آئے ہیں مگر جادو ایک مکروہ لفظ ہے۔ اس کا استعمال بزرگان دین کے حق میں میرے نزدیک تو درست نہیں۔

ناظر: اچھا تو ایک کام کیجئے آپ اپنے حصے کا بٹوار کر لیجئے اور ملحد ہو جائیے۔

حاضر: میرا ذہن اس طرف منتقل ہوا تھا مگر اس صورت میں مشکل یہ ہے کہ جب تک تمام ملکیت تمام مظالم سے پاک نہ ہو میں اس میں سے حصہ لے نہیں سکتا۔

ناظر: آپ نے ساری ملکیت کا ٹھیکہ نہیں لیا۔ اپنے مذہب کی رو سے حصہ پداری میں سے جتنا حصہ آپ اپنا سمجھتے ہوں الگ کر لیجئے۔

حاضر: والد مرحوم کی جگہ میرا اور تمہارا اور غیرت بیگم تینوں کا نام لکھا جانا چاہیے۔ لہذا کمر مثل حط الانشین ہے۔ ہم دونوں نے ناحق اور ناروا بہن کو محروم کر کے اپنے ہی نام چڑھوائے تو نصف ہم دونوں کا ہوا پس سرکاری کاغذات میں میرا نصف حصہ لکھا ہے۔ اس میں بھی تو غیرت بیگم کا ایک عشر شامل ہے جس کو میں اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتا۔

ناظر: آپ بٹوارے کی درخواست میں لکھ دیجئے کہ اگرچہ میرے نام نصف حصہ لکھا ہے مگر حقیقت میں میرا دو خنس ہوتا ہے۔ اسی قدر کا میں بٹوارہ چاہتا ہوں۔ حاکم آپ کی درخواست تصدیق کر کے آپ کے دو خنس کا بٹوارہ کر دے گا۔

حاضر: تو غیرت بیگم کا یہ ایک عشر بھی تمہاری طرف منتقل ہو جائے گا اور اس کے یہ معنی ہیں کہ میں غیرت بیگم کا ایک عشر جو میرے نام ہے تمہارے نام منتقل کر دوں۔

ناظر: خیر معنی مطلب تو میں سمجھتا نہیں۔ ایک راہ کی بات جو میں نے آپ کو بتائی اگر آپ کو مجھ سے پر خاش نہیں ہے تو جس طرح میں نے بیان کیا درخواست لکھئے اور پیش حاکم اس کو چل کر تصدیق کرائیے باقی مراتب میں دیکھ بھال لوں گا آپ کو وہی دوئس ملے گا جو آپ چاہتے ہیں۔

حاضر: غیرت بیگم کا ایک عشر میں تمہارے نام تو منتقل نہیں کرا سکتا وہ بھی ناجائز ہے حقدار کو تو اس کا حق نہ ملا ہاں اگر کہو تو درخواست میں یہ بات بے شک لکھ دوں کہ میرے نام جو نصف حصہ لکھا ہے اس میں دوئس میرا ہے اور ایک عشر غیرت بیگم کا۔

ناظر: اس میں تو میری نصفی میں فتور پڑے گا۔

حاضر: پڑے گا تو تم جانو میرے اختیار کی بات نہیں۔ ”ناظر“ آپ کے اس اصرار سے ثابت ہوتا ہے کہ صرف تقاضائے دین داری نہیں ہے بلکہ ماموں کے سب فساد ہیں!

حاضر: تم بار بار ہر پھر کر ماموں کو ان کی پیٹھ پیچھے برا کہتے جاتے ہو مجھ کو اس بات سے سخت تکلیف ہوتی ہے۔ میں نے تم سے کہا کہ ماموں نے غیرت بیگم کا نام تک نہیں لیا اور تم نے میرے کہنے کو سچ نہ جانا، فرض کرو ماموں ہی نے مجھ کو غیرت بیگم کا حق مغضوب واپس کر دینے پر آمادہ کیا تو احقاق حق میں کوشش کرنا فساد ہے!

ناظر: (یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا) بہت خوب معلوم ہوا۔ آپ آپا کو ان کا حصہ دیجئے اگر آپ سے دیا جائے اور وادیں اگر ان سے لیا جائے اور ماموں جس غرض سے بھانجی کی خوشامد میں لگے ہیں مجھ کو معلوم ہے، بتانا بھائی کو انہوں نے دیکھ پایا ہے بھو! بیوقوف۔ چاہتے ہیں کہ بھانجی کے نام سے جو بڑے ماموں کی تمام املاک پر خود قابض ہو جائیں لیکن (موچھوں پر تاؤ دے کر) اگر ناظر کے دم میں دم ہے تو ماموں کو ایسا مزہ چکھاؤں کہ سات برس بعد تو حج سے پھر کر آنا نصیب ہو اب ان کو ہجرت ہی کرنی پڑے تو یہی۔ آپ کا حصہ لینا ایسا کیا ہنسی کھیل ہے۔

حاضر بے چارہ اپنا سامنہ لے کر سید گمر واپس آ گیا۔ نملگین اداس، کیا خدا کی شان ہے کہ کل شاموں شام سید منتقی کے وعظ سے حاضر متنبہ ہوا تو بہ کی تلافی مافات پر آمادہ ہوا راتوں رات بھاگا ہوا بھائی کے پاس آیا۔ ابھی جی کھول کر بھائی سے باتیں نہیں کرنے پایا تھا کہ سخت امتحان میں پکڑا گیا وہ خوب واقف تھا کہ ناظر ایک سانپ ہے۔ اس بلا کا زہریلا کہ اس کا کاٹا پانی نہ مانگے۔ اس کا ڈسا ہوا پھٹکار نہ کھائے، وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ناظر اگر بگڑا اور اب اس کے بگڑنے میں

کسر ہی کیا باقی تھی تو کیسی زمینداری اور کس کی حصہ داری گاؤں کا رہنا دشوار کر دے گا۔ اور اس کے ہاتھوں سے زندگی وبال دوش ہو جائے گی۔ یہ خیال کر کے وہ جی ہی جی میں اپنے آپ کو سمجھاتا تھا کہ تجھ کو بھائی کے ساتھ بگاڑنا کیا ضروری ہے۔ اگر وہ غیرت بیگم کا حصہ نہیں دیتا تو نہ دے وہ دے جانے اور اس کا کام جانے اپنا اپنا کرنا اپنا اپنا بھرنا۔ غیرت بیگم کا حصہ لینا ہو گا تو آپ سے آپ ناش کریں گے۔ ہر کسے مصلحت خواہش نکو مے داند۔ میری طرف سے اتنا ہی کافی ہے کہ ابھی سے غیرت بیگم کے حصے سے دست بردار ہو جاؤں اور اگر ناش ہو تو دعویٰ کی تردید نہ کروں۔ پھر سوچتا تھا کہ اب تک غیرت بیگم حصے سے بے دخل رہیں۔ اس کا وبال جیسا ناظر پر ویریا مجھ پر زیادہ اور ناظر پر کم کیونکہ میں پٹی کا نمبر دار ہوں اور پٹی کی تحصیل کی وصولی میرے ہاتھوں سے ہوتی ہے۔ علاوہ اس کے کہ کیا یہ انصاف کی بات ہے کہ ہم دونوں بھائی تو بے زحمت اپنے حقوق پر قابض ہوں اور غیرت بیگم کو ناش کرنے پر مجبور کریں صرف اس وجہ سے کہ وہ عورت ہے پردہ نشیں اور کوئی اس کے حق کی حفاظت کرنے والا نہیں دنیا میں آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لی تو خدا کو کیا جواب دیں گے اور مانا کہ میں غیرت بیگم کے حصے سے دست بردار ہو بیٹھا تو وہی بات پھر آئی کہ میں نے لیا نہ ناظر کو لینے دیا۔ غیرت بیگم کو تو اس کا حق پہنچا۔ علاوہ ازیں آج تک تو ایک غیرت بیگم کا معاملہ ہے اس میں یہ جیت ہے ابھی تو ایسے صد ہا معاملے نکلیں گے، غربا کے ضعفاء کے اور ایسے لوگوں کے جن کو سوا خدا کہیں پناہ نہیں اور ناظر کا منشاء تو معلوم ہو چکا کہ وہ تو سوائے قانون کے خدا اور رسول کسی سے ڈرنے دبنے والا نہیں تو بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ بھائی سے تو ایک نہ ایک دن جھگڑے گا ہی۔ اور آج اگر غیرت بیگم کے معاملے میں میں نے ذرا بھی اپنا نصف ضعف ظاہر کیا پھر تو ناظر کی جیت ہے۔ غرض یہ تزاوڑل تو ٹھیک نہیں بلکہ وسوسہ شیطانی ہے۔

سید حاضر نے بتقاضائے دینداری علی الرغم

الف سید ناظر سے اپنی بہن کو اس کا حق دلایا

ایسے اہل اء کے وقت میں خدا نے حاضر کی مدد کی۔ اس کو معلوم تھا کہ ناظر کے پاس مادہ شامپ کا ایک بستہ ہے۔ آخر ڈھونڈ سے ملا۔ کھول کر دیکھتا ہے تو اس میں پرانے پچھلے سنوں کے متعدد قطعات ہیں، سمجھا کہ ناظر نے کسی ارادہ فاسد سے ان کو بھیم پہنچایا ہے۔ اس نے انھنی کا ایک جو قطعہ نیا سادہ کھینے کر تو لے لیا اور باقی اس فساد کی پوٹ کو چو لھے میں جمونک دیا جو قطعہ اس نے نکال لیا تھا، اس پر ایک درخواست لکھی جس کی عبارت یہ تھی (نقل درخواست) کہ میں اور سید ناظر اور غیرت بیگم تینوں حقیقی بھائی بہن ہیں، غیرت بیگم کا نام پٹی داری میں داخل ہونے سے رو گیا میں پٹی کا نمبر دار ہوں اور میرے ہاتھوں پٹی کی تحصیل وصول ہوتی ہے۔ غیرت بیگم کے حق اور قبضے کو میں تصدیق کرتا ہوں اس لیے غیرت بیگم کا نام ایک خنس حصے پر چڑھا دیا جائے۔ اور اسی وقت درخواست کو رجسٹری کر کر حاکم پر گنہ کے نام روانہ کر دیا۔ وہاں سے معمول کے مطابق اشتہار جاری ہوا۔ اشتہار کا آتا تھا کہ سید ناظر نے عذر داری کا مقدمہ لڑنا شروع کیا۔ کلکٹری میں تو سرسری کارروائی ہوتی ہے۔ اور صرف قبضہ دیکھا جاتا ہے۔ چونکہ نمبر دار پٹی نے جس کے ہاتھ سے پٹی کی تحصیل وصول ہوتی تھی غیرت بیگم کے قبضے کی تصدیق کی۔ اس سبب سے ناظر کی عذر داری نامنظور اور غیرت بیگم کا نام ایک خنس پر داخل ہونے کا حکم ہو گیا مگر سید ناظر محکمہ کلکٹری کو کیا مال کو کچھ سمجھتا تھا۔ جس وقت داخل خارج کا حکم پہنچا تو اس کے مختار نے تسبی کے طور پر اس سے کہا کہ نمبر دار کے بیان مجرد پر حکم ہو گیا ہے۔ یہ حاکم کی رائے ہے۔ اپیل کی بڑی گنجائش ہے۔ ناظر نے کہا ارے میاں کہاں کی اپیل اور کس کامرافہ کل تو نہیں پرسوں تم کو والد کا تحریری وصیت نامہ لا کر دیتا ہوں۔ اس کی بنیاد پر اثبات حقیقت کا دعویٰ (خاک از تو دو کماں بردار) دیوانی میں دائر کرو تو نمبر دار کی ساری شیخی کر کر لی ہو جائے گی۔ ناظر وصیت نامہ لینے گھر دوڑا ہوا آیا اور اسٹامپ کے بستے کی تماش میں سیدھا کوٹھڑی میں گھسا بستہ نداد اس کا ماتھا ٹھنکا، معلوم ہوا کہ ایک بستہ تو بڑے میاں کوئی ڈیڑھ مہینہ ہوا جلا چکے ہیں۔ یہ سنتے ہی پیٹ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ حاضر ناظر کا جھگڑا ہمارے قصے سے متعلق نہیں ہے۔ خلاصہ یہ کہ دونوں بھائیوں میں ایسی چلی ایسی چلی کہ سید نگر والوں میں بھی جو سنتا دانتوں میں انگلی رکھ لیتا تھا قاعدہ ہے کہ آٹے کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ سید حاضر کے ساتھ غیرت بیگم اور غیرت بیگم کی لپیٹ میں سید منتقی کی بھی شامت آئی۔

## سیدناظر کے فسادات، میر متقی کی نسبت عرضی گم نام

### میر متقی کے سمجھانے سے اصلاح ذات البین کا ہونا

ناظر کو شروع میں صرف اسی پر اصرار تھا کہ غیرت بیگم کو حصہ نہ دوں۔ شامپ کے بستہ کو جانا سن کر وہ بھائی پر نہایت برا فروختہ ہوا اور اس نے دیوانی میں سالم حقیقت پردی کا دعویٰ دائر کیا۔ اس بیان سے نہ حاضر میر باقر کا بیٹا نہ اور نہ غیرت بیگم میر باقر کی بیٹی۔ اس نے بات یہ بنائی کہ میر باقر کا اکلوتا بیٹا میں ہوں میرے پیدا ہونے میں دیر ہوئی تو میر باقر لے پالک کے طور پر حاضر کی پرورش اور پرداخت کرنے لگے اور اس بیان کی تائید میں شامپ کے کاغذ پر ایک وصیت نامہ پیش کیا جس پر میر باقر کی مہر تھی اور اس کا سوا دھنڈ بھی میر صاحب کے خط سے مشابہ میر متقی کی نسبت ایک گم نام عرضی لیٹیفینی میں پہنچی کہ سلطان روم کی طرف سے جاسوس بن کر آئے ہیں اور لوگوں کو چپکے چپکے جہاد کی ترغیب دیتے ہیں اور عنقریب ہندو مسلمانوں میں ان کے اغواء سے فساد عظیم ہونے والا ہے۔

سید حاضر کو جب دیوانی کے دعویٰ کا حال معلوم ہوا تو عرضی دعویٰ کی نقل لے کر سید متقی کے پاس دوڑا ہوا آیا۔ سید متقی کو اس وقت تک داخل خارج کے سوا کچھ حال معلوم نہ تھا دور سے حاضر کو دیکھتے ہی خوش ہو کر لگے تحسین و رضا کی باتیں کرنے، حاضر نے پاس آ کر ناظر کی عرضی دعویٰ کی نقل دکھائی تو انا اللہ وانا الیہ راجعون کہہ کر ایسے سناٹے میں گئے کہ بہت دیر ہو گئی اور برایا بھلا کوئی بھی لفظ منہ سے نہ نکالا تو ناظر نے خود ابتدا کی اور کہا کہ میں اس غرض سے حاضر ہوا تھا کہ میں تو اپنے میں ناظر کے مقابلہ کی طاقت نہیں پاتا عزت کو، آبرو کو، سچائی کو، دین کو، ایمان کو، خوف خدا کو، سب کو۔ ایک دم سے بالائے طاق رکھ دوں تو ناظر کے ساتھ لڑنے کا نام لوں اور یہ مجھ سے اب نہیں ہو سکتا، ہر چند ردہ کر غصہ آتا ہے اور بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اس مردک کو اسی قانون سے جس پر اس کو بڑا گھمنڈ ہے اس کے کیے کی ایسی سزا دوں گا ساری عمر اس کو قید سے نجات نہ ہو اور اس کی تدبیریں سمجھ میں آتی ہیں اور میرے اختیار کی بھی ہیں۔ ناظر کتنا ہی قاعدہ دان اور ضابطہ شناس کیوں نہ ہو۔ آخر نہ تو مجھ سے چھوٹا لیکن آپ کے ارشاد کے مطابق میں خدا سے عبد کر چکا ہوں کہ دنیا کے لیے دین کو نہیں بگاڑوں گا۔ اب دنیا میں ایک فضیلت نہیں ہزار فضیلت اور ایک نقصان نہیں ہزار نقصان کیوں نہ ہو جائیں۔ اس عبد کو تو میں تو نہیں سکتا مگر ناظر کے حملے سے بچنے کے لیے میں نے ایک تدبیر سوچی ہے۔ میر غالب کو تو آپ جانتے ہوں گے وہ



بھی ان دنوں سید نگر کے بڑے چلتے ہوئے پرزوں میں ہیں۔ سید نگر خاص میں ان کا بھی تھوڑا سا حصہ ہے۔ ان کی وکالت آج کل بڑے زوروں پر ہے۔ چند روز ہوئے مجھ سے کہتے تھے کہ اگر کوئی حصہ بکنا ہو تو مجھ کو خبر کرنا تو میں نے یہ تجویز سوچی ہے کہ اپنا حصہ ان کے ہاتھ فروخت کر دوں جو اب ترکی بتر کی وہ ناظر سے سمجھ بوجھ لیں گے۔ اتنا ہی خیال ہے کہ گاؤں میں حصہ ہے تو رعایا پر سوطر ح کی حکومت ہے مگر جس طرز پر مجھ کو آئندہ زندگی گزارنی منظور ہے اس کے لیے مجھے حکومت درکار نہیں۔ آپ سے اتنی بات پوچھنی تھی کہ اگر آپ کی صلاح ہو تو غیرت بیگم کے حصے کی بھی بات حیت میر غالب سے کی جائے، میں نہیں سمجھتا کہ غیرت بیگم کو ناظر چین لینے دے گا۔ یہ سن کر میر منقی نے کہا کہ ان معاملات کو تم مجھ سے بہتر سمجھتے ہو۔ قرابت کے اعتبار سے بھی تم نزدیک تر ہو اور تمہارے معاملے کی سچائی کا یہی بڑا ثبوت ہے کہ تم نے بے فریاد بے نالاش غیرت بیگم کو اس کا حق دیا اور دلوا دیا اور بلکہ حق کے واسطے تم نے بھائی سے بگاڑی اور اس بگاڑ کے نتائج کی پہلی قسط یہ عرضی ہے جو تم نے مجھ کو دکھائی۔ خدا حق ہے اور وہ حق سے راضی ہوتا ہے اور وہی حقداروں کی حمایت کرنے والا ہے۔ اور انشاء اللہ آخر حق کو غلبہ ہے الحق یعلو اس بات میں تم اپنی بہن سے مشورہ کرو لیکن اگر میری رائے پوچھتے ہو تو شروع سے تم نے غلطی کی۔ تم نے وہ کیا اور آئندہ بھی وہی کرنا چاہتے ہو جو دنیا میں سبھی راست معاملہ کیا کرتے ہیں اور بلاشبہ شرع کی رو سے تم پر کوئی الزام نہیں مگر الزام کے عائد نہ ہونے سے تم کسی تحسین کے بھی حقدار نہیں۔ تم کو اور غیرت بیگم دونوں کو صلاح دیتا ہوں کہ اگر کر سکو تو اپنے اپنے حق سے دست بردار ہو جاؤ ایسی کوئی بڑی مالیت ہے۔ خدا نے تم کو بہت کچھ دے رکھا ہے، ناظر کو موروثی کچھ انسیاں مبارک۔ لے کر وہی بڑے آدمی نہیں آخروہ بھی تو کوئی غیر نہیں، کبھی کہاں گیا کچھڑی میں۔ تین بہن بھائیوں کے پاس نہ رہا، ایک کے پاس رہا۔ بلاشبہ حصہ گو کتنا ہی جزوی کیوں نہ ہو چھوڑنا مشکل ہے۔ خصوصاً جب کہ موروثی ہو اور اسی گاؤں کا ہو۔ جس میں رہنا سہنا ہے اور چھوڑنا بھی اس حالت میں کہ گالی گلوچ تک کی نوبت پہنچ چکی ہو لیکن تم خود کہتے ہو کہ اب بدوں فنیات کے اس کا سنبھالنا ممکن نہیں۔ حصہ منتقل کر دینے کی تجویز جو تم نے سوچی ہے۔ صرف من سمجھوتی ہے۔ آخر اس کی تحقیقات ہوگی ہی۔ تمہارے مقابلے میں ہو یا خریدار کے کہ تم دونوں میر باقر کی اولاد ہو جیسا کہ واقعی ہے یا نہیں ہو جیسا کہ ناظر نے عرضی دعویٰ میں لکھا ہے۔ اگرچہ کامل یقین ہے کہ آخر کار تم کو ناظر کے مقابلہ میں ظفر ہوگی لیکن پھر بھی ہمیشہ کے لیے وہ تم سے چھوٹے جائے گا اور تم اس سے، اور مدت العمر تم کو بائیں خرخشٹوں سے نجات ملنے کی امید نہیں مگر جو تدبیر میں بتاتا ہوں اس کا انجام جہاں تک میری سمجھ میں آتا ہے انشاء اللہ یہی ہوتا ہے کہ حصے کا حصہ تمہارے پاس رہے گا اور تم بھائی بہن پھر ایک کے ایک ہو جاؤ گے۔ تھوڑی دیر کے لیے فرض کرو کہ ناظر نے کل حصہ لیا مگر اس طرح کہ وہ لینا چاہتا ہے یعنی جھوٹے بول کر جعلی بنا کر بھائی بہن کو ماں کو باپ کو یعنی اپنے آپ کو

رسوا اور فضیحت کرنا کیسا صاف صاف گالیاں دے کر تو ناظر یہ حصہ لے کر تمام کو تو خیر چھوڑ ہی دے گا مگر کیا بیوی بچے رشتہ دار کنبہ دار قبیلہ برادری خاندان دوست آشنا جان بیچان ایک دم ساری دنیا کو چھوڑ دے گا۔ ایسا تو نہیں ہو سکتا مگر سمجھتے ہو کہ دنیا اس کو کیا کہے گی۔ اعنت کرے گی۔ یگانے اور بے گانے سب اس کے منہ پر تھوکیں گے۔ لڑکے اس کے پیچھے تالیاں پیٹیں گے۔ سب کی نظروں میں وہ خوار اور بے اعتبار نکو اور انگشت نما ہوگا۔ درو دیوار اور کوچہ بازار سے اس پر پھٹکار برے گی۔ یہ حصہ ڈھاک کے کوئلے کا ایک دہکتا ہوا انگارہ ہوگا کہ وہ ہرگز اس کو مٹھی میں سنبھال نہ سکے گا۔ مشکل سے مشکل مقدمات اور پیچیدہ سے پیچیدہ معاملات میں تم ایک مختار وکیل کے کہنے پر عمل کرتے ہو۔ اس ایک بات میں خدا کی صلاح پر بھی چل کر دیکھو کہ کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ خدا کی صلاح کیا ہے۔ اذیع بالقی ہی احسن فاذا الذی بینک عداوۃ کا نہ ولی حمیم یعنی اگر تجھ سے کوئی لڑائی کرے تو بھلائی کے ساتھ اس کا توڑ کر اور پھر دیکھ کہ یا تو تجھ میں اور اس میں دشمنی تھی یا بات کی بات میں وہ تیرے ساتھ گرم جوشی کرنے لگا۔ حقیقت میں جیسی میر منقی نے پیشین گوئی کی تھی وہی ہوا۔ حاضر اور غیرت نیگم کی طرف سے ناظر کے دعویٰ کی کچھ تردید نہ ہوئی قاعدے کے مطابق دعویٰ یک طرفہ ڈگری ہو گیا۔ مگر کیسی ڈگری کہ حاکم اور عملے اور اہل معاملہ اور چپڑاسی اور مدکوری سبھی نے تو ناظر کو ملامت کی۔ جہاں گیا اس نے لتاڑا اور جس سے ملا اس نے لتھیرا اور آخر کار ہار کر جھک مار کر کانک کا ٹیکہ ماتھے پر لگا کر جس قدر گالیاں تقدیر میں تھیں سن کر جتنی بدنامی مقدر میں تھی بھگت کر بصد منت و بہزار خوشامد ہاتھ جوڑ کر پاؤں پڑ کر وہی دوئس حصہ حاضر کو اور وہی ایک نمس غیرت نیگم کو دیا اور ساری عمر کے لیے ناحق بیٹھے بٹھائے بھائی بہن کو کنوینڈ انٹراڈ اسوا لگ۔

## میر متقی کا بتانا کو سمجھانا اور

### اس کی اصلاح حال میں کوشش کرنا

پچھلے بیانات سے بخوبی ظاہر ہو گیا ہو گا کہ غیرت بیگم کے جتنے معاملات تھے، سبھی تو خدا نے میر متقی کے ہاتھ سے درست کرائے اور کیسی عمدگی اور خوش اسلوبی کے ساتھ کہ نہ لڑائی نہ جھگڑا نہ قصہ نہ فساد نہ غل نہ شور و غواہیں بھی جاری ہو گئیں ملکانات اور دکانات کا بھی انتظام ہو گیا ناظر جیسے موزی کے پنچے سے حصہ زمینداری بھی چھٹا جس کے چھوٹنے کا کسی کو سامان گمان بھی نہ تھا۔ مگر ابھی غیرت بیگم کا سب سے بڑا معاملہ باقی تھا یعنی اس کے شوہر بتانا کی اصلاح اس کی آوارگی کا علاج اس کی بد وضعی کی روک تھام۔ عورت جب بیاہی گئی تو میاں ہی سے اس کا آرام میاں ہی اس کا عیش اور میاں ہی سے توقیر ہے اور میاں ہی سے اس کا اعزاز و احترام۔ آپس میں پیارا خلاص ہو تو دنیا کی ساری مصیبتیں جھیلی جاسکتی ہیں اور جہاں دلوں میں محبت نہیں پہننے میں مزد اور کھانے میں لذت نہیں دل میں امنگ نہیں سنگھار میں بہار نہیں پھولوں میں باس نہیں، مہندی میں رنگ نہیں۔ میر متقی کچھ اس سے غافل نہ تھے مگر بتانا کے بارے میں ان کو بڑی مشکل یہ پیش آرہی تھی کہ ان میں اور بتانا میں کئی سبب سے اختلاط اور واشدگی کا ہونا ممکن نہ تھا۔ اول تو رشتہ کہ میر متقی بتانا کے چچا باپ کی جگہ۔ دوسرے عموں کی بڑائی چھٹائی کہاں میر متقی پچاس پچپن برس کے بوڑھے اور کہاں بتانا بیس برس کا پنٹھا۔ تیسرے بتانا کے ہوش میں میر متقی کو دہلی آتے ہوئے یہ تیسرا پھیرا تھا ایسی صورت میں اجنبیت تو ہونی ہی چاہیے۔ چوتھے وضع میں عادات میں خیالات میں ایک کو دوسرے سے مطلق مناسبت نہیں، پس حال یہ تھا کہ میر متقی مردانے میں ہیں تو بتانا زنان خانے میں قدم رکھا ادھر بتانا آہٹ پاتے جھٹ باہر نکل آتا۔ رات دن میں صرف دو بار دوپچا بیتیجے بہ ضرورت کھانے کے لیے دسترخوان پر جمع ہوتے تھے۔ وہ بھی کس طرح کہ بتانا نے چچا کے سامنے جانے کے لیے ٹوپی اور کپڑے اور جوئی سب چیزیں سادہ اور بھلے مانسوں کے استعمال کی الگ کر رکھی تھیں۔ کھانے کے لیے طلبی آئی اور اس نے جلدی جلدی رگڑ رگڑ کر منہ دھویا، موچھوں کو جن پر سارا دن ماش رہتی تھی بل نکال کر سیدھا کیا، پیوں کو ابھارا، باؤں کی سج صج کو بگاڑا، کھانے کے نہیں چچا کے سامنے جانے کے کپڑے پہنے اور گر بہ مسکین بن کر جھکے ہوئے نیچی نظر مودب دسترخوان پر جا بیٹھے پھر میر متقی کا کھانا کوئی انگریزی ڈزرتو ہوتا ہی نہ تھا کہ کھانا میز پر آیا اور جتنے کھانے والے تھے۔ اپنی اپنی کرسیوں پر چرہ غننے لگے۔ دنیا بھر کی بکواس شروع ہوئی اور یہ بھی نہیں کہ کھانے کے ضمن میں باتیں کرتے جاتے ہوں بلکہ یوں کہو کہ باتوں کے ضمن میں

کھانا بھی کھاتے جاتے ہیں۔ میر منقی مولوی آدمی دور سے کھانا آتا ہوا دیکھ کر کسی شغل میں ہوں، چھوڑ چھاڑ پہنچوں تک ہاتھ دھو بسم اللہ الرحمن الرحیم کہہ کر اکڑوں ہو بیٹھے کھانا کھایا مگر اس کو بھی عبادت سمجھ کر خیال یہ کہ آداب الطعام میں سے کوئی ادب منزل و کعبہ نہ ہو۔ پس ان کے دسترخوان پر بات چیت کا کیا موقع میر منقی مستعمل کہ کم کھاؤں بتانا منتظر کہ اٹھ جاؤں الغرض ایسا کوئی موقع ہی نہیں بن پڑتا تھا کہ چچا نتیجے میں جی کھول کر باتیں ہوں مگر میر منقی بلا کے تازے والے تھے۔ انہوں نے اتنی ہی دیر کی صحبت میں بتانا کی حرکات و سکنات سے اس کی نشت و برخاست سے اس کی طرز عادت سے اتنا جان لیا اور ایسا پہچان لیا کہ بتانا کے لنگوٹے یا راور اس کے بھیدی اور راز دار بھی اتنا ہی جانتے ہوں گے۔ بتانا اگر چہ ان کے سامنے اپنے آپ کو بہت ضبط کئے رہتا تھا مگر اسی دن کے لیے کہتے ہیں کہ آدمی بری لت نہ ڈالے اور عادت کو بگڑنے نہ دے، بتانا کو خبر تک نہ ہوتی تھی اور بے خیالی میں آدبا کر چچا کے سامنے اس سے کوئی حرکت ایسی سرزد ہو جاتی تھی کہ ہر روز ان کی نظروں میں اس کی قلعی کھلتی رہتی تھی مثلاً بیٹھے بٹھائے خود بالوں پر ہاتھ جا پڑا اور عادت کے مطابق لگا وہیں پیٹیاں جمانے پھر جو ہوش آیا چچا کو کن انکھیوں سے دیکھ کھانے کے حیلے سے بالوں کو بگاڑ سیدھا ہو بیٹھیا کھاتے کھاتے ایک مرتبہ انگر کے کی چولی کے شکن نکالے لگاتن کر سینے کو دیکھنے اتنے میں چچا پر نظر جا پڑی اور جلدی سے پھر جبکہ کر ہو بیٹھا۔ ایک مرتبہ تو اس نے کیا غضب کیا کہ خدا جانے کس خیال میں مستغرق تھا کہ آپ ہی آپ لگا گنگنا نے مگر میر منقی نے اس کو ایسے طور پر نال دیا کہ گویا سنا ہی نہیں۔ بتانا اپنے دل کو یوں سمجھا لیا کرتا تھا کہ چچا نے دعیان نہیں کیا اگر کیا تو آدمی سے ایسی غور کرتیں ہوا ہی کرتی ہیں۔ اتنی ہی بات سے ان کا ذہن اس طرف کیوں منتقل ہونے لگا کہ پیٹیاں جمانا یا اکڑنا یا گانا میری عادت ہے لیکن یہ اس کی غلطی تھی میر منقی کی آنکھ کبھی کسی چیز پر اچھتی ہوئی پڑی ہی نہ تھی وہ جس چیز کو ایک نظر دیکھ لیتے۔ اس کی یہ تک پہنچ جاتے اور اس کے لم کھو دو دریافت کرتے، میر منقی نے بتانا کی حرکات سے آخر یہ استنباط کیا کہ اس میں دو مہم بہت بڑے ہیں، اول یہ مذہب سے اس کو مطلق سروکار نہیں، یہ جانتا ہی نہیں کہ خدا بھی کوئی چیز ہے اور آدمی اس کے بندے ہیں، اس کو خبر ہی نہیں کہ آدمی کو کھانے اور سو رہنے کے سوا دنیا میں کچھ اور بھی کرنا ہے۔ دوسرے حسن پرستی اس کے نزدیک دولت، شرافت، حسب نسب، علم، ہنر، سلیقہ، اخلاق، دین داری غرض دنیا کے سارے کمالات، ہیچ ہیں۔ صرف ایک حسن صورت قابل قدر ہے۔ اور بس، میر منقی کا ایک قاعدہ اور بھی تھا کہ بڑے دھیسے آدمی تھے۔ جب کسی خاص شخص کو نصیحت کرنا منظور ہو تا تو مدتوں اس کے حالات کی تفتیش میں لگے رہتے اور جب معلوم کر چکے جس قدر معلوم کرنے کی ضرورت تھی تو ہفتوں غور کرتے کہ کس پیرائے سے اور کیسے وقت اس کو نصیحت کروں کہ موثر ہو اور یہی سبب تھا کہ ان کی نصیحت کبھی خالی گئی ہی نہیں۔ اگر ایک شخص تارک الصلوٰۃ ہے اور انہوں نے اس کو نماز کے لیے نصیحت کی تو پھر سفر یا مرض

دنیا کی کوئی کیسی ہی ضرورت کیوں نہ ہو اس نے مدت العمر نماز کو قضا نہیں ہونے دیا یا اگر کوئی شخص منہیات شرعی میں کسی کا مرتکب بنے اور انہوں نے واعظ کہا تو پھر تو بہ ہی کرا کے چھوڑا۔ غرض میر مرتقی نے ایک دن موقع پا کر جوں ہی بتانا کھانا کھا کر جانا چاہتا تھا اس کو روکا اور کہا کہ ذرا ٹھہرو مجھ کو تم سے کچھ کہنا ہے۔ بتانا سمجھا کہ آج نماز گلے پڑی بیٹھ گیا تو میر مرتقی نے فرمایا (وعظ) اگرچہ مجھ کو تمہارے حالات بالخصوص معلوم نہیں مگر جس قدر معلوم ہیں ان سے میرا خیال یہ ہے کہ تمہاری تعلیم جیسی درستی کے ساتھ ہونی چاہیے تھی نہیں ہوئی، تمہاری تعلیم کا عمدہ حصہ وہ ہے جو مدرسہ میں ہوا، مدرسے کی تعلیم اس اعتبار سے کہ جو چیزیں پڑھائی جاتی ہیں دنیا میں بکار آمد ہیں بلاشبہ مفید ہیں مگر افسوس بڑے سخت افسوس کی بات ہے کہ مذہب کی طرف بھول کر بھی کوئی توجہ نہیں کرتا، مذہب کو سلسلہ درس سے اس طرح نکال کر پھینک دیا ہے جیسے دودھ سے مکھی، جس سے لوگوں پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ مذہب ایک فضول اور بالکل بی چیز ہے اور دنیا میں اس کی مطلق ضرورت نہیں۔ پس مدرسوں کی تعلیم کا نتیجہ کیا ہے کہ نوجوان لڑکے فارغ التحصیل، فضیلت کے خطاب اور لیاقت کی سندیں لے کر مدرسوں سے نکلتے ہیں۔ ان کو تمام ملکوں کی نئی و پرانی تاریخیں خوب مستحضر ہوتی ہیں۔ جغرافیہ میں شاید ان کی معلومات اس درجہ کی ہوں کہ سمندر کی مچھلی ہیں یا پہاڑی کوئے یا افریقہ کے رچھ یا آسٹریلیا کے لنگور یا امریکہ کے بن مانس یا تبت کے دنبے تا تار کے مینڈھے یا عرب کے بدویا یورپ کے فرنگی یا ہندوستان کے بھیل و دانگریزی شاید ایسی عمدہ لکھ سکتے ہوں گے کہ گویا ان کی مادری زبان ہے۔ ریاضی میں وہ شاید وقت کے بطریقوں ہوں، علم ہیئت میں وہ اپنے زمانہ کے فیثاغورث، فلسفے میں افلاطون غرض ان میں علوم دنیا کی ایسی جامعیت ہوگی کہ شاید ان کی نظیر نہ ہو مگر وہ مذہب کے معتقد، خدا کے بندے، نہ رسول کی امت، نہ بادشاہ کی رعیت، نہ باپ کے بیٹے، نہ بھائی کے بھائی، نہ دوست کے دوست، نہ قوم کے ساتھی، نہ برادری کے شریک، نہ وضع کے پابند، نہ رسم کے مقلد۔ ذرا نظیر انصاف سے اس بات کو دیکھو کہ فی الحقیقت مدرسے کی تعلیم میں ایسے خیالات پیدا کرنے کا رجحان ہے یا نہیں ہے اور ضرور ہے اور اس کا سبب ظاہر ہے کہ مختلف مذاہب کے نوجوان لڑکے ایک جگہ جمع رہتے ہیں۔ اپنے اپنے عقائد سے سب کے سب بے خبر عموماً کے تقاضے یہ کہ جہاں اور ہنسی کی باتیں کرتے ہیں ان میں ایک مذہب کا استخفاف بھی ہے اگرچہ اپنا ہی مذہب کیوں نہ ہو۔ مدرسے کے حاکم یا مدرس کچھ مذہب کی پروا کرتے ہی نہیں، طالب علموں کے لیے سب کیونکہ ان کا فرض خدمت نہیں اپنے لیے بھی بعض یا اکثر اس لیے کہ خود کسی مذہب کے قائل نہیں۔ وظیفہ یا انعام یا دوسرے موجدات ترغیب مذہب پر کسی کا انحصار نہیں۔ علوم جو پڑھاتے جاتے ہیں اکثر جدید زمانہ حال کے ایجاد کوئی مسئلہ نہیں جس میں متقدمین کی غلطی جس میں سابقین کی خطا ظاہر نہ کی جائے اور ایک بڑی خرابی آکر یہ پڑی ہے کہ بہت سی باتیں ہیں تو علوم دنیا سے متعلق مگر لوگوں کی غفلت یا بے مبالغہاتی سے داخل مذہب سے ہیں

کورے، معلوم ہوتا ہے کہ ان کے باپ دادا جو مذہباً۔۔۔ ایسی افواہیں پھیلانے لگے تھے چلے آئے زے احمق تھے اور ان کا مذہب ہی سراسر بیچ اور پوچھنے ایک خرابی اور بے اور علوم جدید و جن کا مدارس میں بڑا زور و شور ہے، سب ہیں از قسم بدیہات، مشاہدات پر مبنی اور تجربات پر مبنی۔ ایسے علوم پڑھتے پڑھتے طالب علموں کو اس بات کی عادت پڑ جاتی ہے کہ وہ ہر چیز کا ثبوت ایسا ہی ڈھونڈنے لگتے ہیں جیسے اقلیدس کے دعوؤں کا۔ ایک مذہبی باتوں کے لیے ایسا ثبوت نہ ہوا ہے اور نہ ہونا ممکن ہے۔ حضرت موسیٰ سے بھی یہودی ایسی ہی بے جا فرمائشیں کرتے تھے۔ سن یزمن لک حتی نری اللہ جہوہ، ہم تم جب تک خدا کو کھلے خزانے نہ دیکھ لیں تجھ پر ایمان لانے والے ہیں تو نہیں لیکن مذہب کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ انسان کی ضعفِ خلقت کے سبب۔ کیا اگر موسیٰ خدا کا دیدار یہود کو نہ دکھا سکے تو اس سے لازم آ گیا کہ خدا نہیں ہے۔ نہیں خدا تو ہے مگر وہ آدمی کی آنکھوں میں آنے کی چیز نہیں ہے۔ مدارس کی تعلیم بلکہ سچ پوچھو تو عمل داری کا خلاصہ ہے، آزادی بلاشبہ آزادی ہر ایک فرد بشر کا ایک ضروری حق ہے مگر آزادی کی بھی کوئی حد ہوتی ضرور ہے آدمی کی بناوٹ اس طرح کی واقع ہوئی ہے اور آدمی فی حد ذاتہ اس طرح کی مخلوق ہے کہ آزادی مطلق تو اس کو حاصل ہونی ممکن نہیں اور مناسب بھی نہیں۔ کیا آزاد ہو سکتا ہے وہ بند دنیا چیز جس کا ہونا اور نہ ہونا اس کے اختیار میں نہیں، غیروں کا محتاج۔ دوسروں کا دست نگر پہننے میں کھانے میں پینے میں مرنے میں جینے میں چند منٹ کے لیے ہوانہ ملے تو ہلاک۔ ایک وقت خاص تک غذا نہ پہنچے تو فغا ترا کے کی دھوپ کا خشم نہیں کڑا کے کی سردی کی برداشت نہیں۔ حالت تو اس قدر خستہ و خراب اور اس پر آزادی کا سرخاب وہی مثل ہے۔ جھونپڑے کا رہنا اور مخلوق کے خواب۔

باندھتے ہیں سرو کو آزاد اور وہ پابہ گل

کیسی آزادی کہ یاں یہ حال ہے آزاد کا

میں اس میں لڑکوں کا زیادہ قصور نہیں پاتا۔ سارا قصور ان کی تعلیم و تربیت کا ہے۔ گھڑی جو تمہاری جیب میں ہے اس میں نواد کی ایک کمائی کنڈی کے طور پر تہ کی ہوئی موجود ہے۔ کنجی کے زور سے کمائی کی تہوں کو خوب کس دیتے ہیں، اسی کو کوکنا کہتے ہیں۔ کوکنے سے کمائی میں ایک قوت پیدا ہوتی ہے۔ کمائی چاہتی ہے کہ کھلے اور اپنی اصلی حالت پر عود کر آئے۔ اگر کوئی چیز مانع نہ ہو تو کمائی سڑ سے دم کے دم میں ڈھیلی پڑ جائے اور وہ قوت جو اس میں پیدا کی گئی تھی اکارت ہو۔ اس کے روکنے کے لیے گھڑی میں ایک پرزہ لگایا جاتا ہے جس کا نام ہے ریگولینر اور اس قوت سے وقت کی شناخت کا علیحدہ کام لیا جاتا ہے، یہی حال ہے انسان کا کہ اس میں بھی ایک حالت کے مناسب خدا کی دی ہوئی چند قوتیں ہیں اگر ان قوتوں کا کوئی روکنے والا ریگولینر نہ ہو تو یہ تمام قوتیں بے کار ہیں بلکہ بجائے مفید ہونے کے الٹی مسخر۔ انسان کا ریگولینر ہے مذہب جو اس

کو اندازہ مناسب اور حد اعتدال سے گھٹنے بڑھنے گرنے ابھرنے نہیں دیتا۔ مدرسوں کی تعلیم کوک بنے اور ریگولیٹر ندارد۔ پس اس کا ضروری نتیجہ بنے کہ آزادی کا خیال دل میں ساتے ہی لوگ ہر طرح کی قیود سے نکلنے کی خواہش کرنے لگتے ہیں؛ یہاں تک کہ قید عبودیت سے بھی سرے سے مدرسے کی تعلیم کے اصول ہی غلط ہیں کہ صرف دنیاوی علوم کے پڑھا دینے سے آدمی دنیا کے کام کا ہو جاتا بنے۔ اس سے تو یہ بات نکلتی بنے کہ دنیا اور دین دو چیزیں ہیں؛ جدا گانہ ایک کو دوسرے سے کچھ تعلق نہیں؛ ہم نہیں جانتے کہ جو لوگ ایسا خیال کرتے ہیں دین سے کیا مراد رکھتے ہیں۔ مگر ہمارے نزدیک بلکہ تمام اہل ادیان کے نزدیک دین کے معنے ہیں؛ انسان کی اصلاح اور اس کے دو حصے ہیں؛ اصلاح معاش اور اصلاح معاد؛ پس دین اور دنیا میں اگر ایک طرح کی منطقی مغایرت بنے جیسے عموماً کل و جز میں ہوا کرتی بنے۔ اس کو تباہن یا تناقض یا تنافر یا بے تعلقی سے تعبیر کرنا مغالطہ ہی بنے۔ کتنا ہی پڑھاؤ جب انسان میں دین نہیں دیانت نہیں اس پر بھی اگر وہ آدمی دنیا کے کام کا بنے تو اس دنیا کو خیر باد بنے اور اس دنیا کو سلام ایک بات تعلیم کے متعلق اور بھی سوچنے کی بنے کہ انسان کو دوسرے حیوانات سے ایک وجہ امتیاز یہ بھی بنے کہ حیوانات کو جتنی عقل دی گئی بنے فطری بنے۔ تجربے یا امتداد عمر سے اس میں ترقی نہیں ہوئی مثلاً بیا گھونسلا بناتا بنے کیسا عمدہ کہ انسان اس کی اگر پوری پوری نقل کرنا چاہے تو نہیں بنے پڑتی مگر جیسا گھونسلا ایک بڑھا بیا بناتا بنے جو اپنی عمر میں شاید بیس پچیس گھونسلے بنا چکا ہوگا۔ بخسہ و بیا ہی گھونسلا پہلی بار ایک نوجوان بیا بنائے گا برخلاف انسان کے کہ اس کی عقل تجربے اور عمر کے ساتھ کمال حاصل کرتی جاتی بنے۔ اس مضمون کو سعدی نے کیا قس دل طور پر ادا کیا بنے:

مرنگ از بیضہ بروں آید و روزی طلبہ  
آدمی ز اود نہ دارد خرد و عقل و تمیز  
آن نباگاہ کے گشت و پھیز سے نہ رسید  
ویر بہ حکمین و فضیلت بہ نشت از ہمہ چیز

اس لیے انسان کی تعلیم و تربیت کا قاعدہ یہ بنے کہ ہر چیز اس کی عمر کا ایک مناسب وقت دیکھ کر سکھاتے ہیں؛ مثلاً غیر ملک کی بولی ضرور بنے کہ بچپن میں سکھائی جائے ورنہ بڑے ہو کر زبان مشکل سے ٹوٹتی بنے۔ چھوٹے بچے کو اگر منطق کے پیچیدہ مباحث سمجھانا چاہو تو سعی لا حاصل بنے۔ اسی طرح دین کی تعلیم کے لیے بھی ایک وقت مناسب ہونا چاہیے اور وہ نہیں ہو مگر سن طفولیت کیونکہ آدمی کی عمر جس قدر بڑی ہوتی جاتی بنے۔ اسی قدر فطرت سے دور اور اس کا دل لوٹ دنیا سے آلودہ اور زنگ اغراض سے تیرہ ہوتا چلا جاتا بنے۔ پھر شاید ایک وقت ایسا آئے کہ اس کے دل میں صبغت اللہ یعنی دین کے رنگ اٹھانے کی قابلیت باقی نہ رہے نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیات اعمالنا۔ اسی حالت کی نسبت قرآن مجید

میں فرمایا ہے۔ کلابل دان علی قلوبہم ما کانوا یکسبون اور کچھ بات نہیں ان کے دلوں پر ان کی بدکرداریاں جم گئیں ہیں۔ دنیا میں اور بھی ہزاروں لاکھوں اللہ کے بندے ایسے ہیں جن کو دین کی طرف سے مطاق توجہ نہیں۔ مگر بے توجہی دو طور کی ہے۔ ایک وہ جس کا سبب کابلی اور غفلت اور مسہلت ہو دوسری وہ جو دین کے استخفاف سے پیدا ہو یہی ہے توجہی ہے جو نہایت خطرناک اور نہایت مذموم ہے اور یہی ہے توجہی ہے جس کو مدارس کی تعلیم پھیلائے چلی جا رہی ہے لیکن دین و مذہب لوگوں کی قدردانی اور تسلیم کا محتاج نہیں ہے۔ ہمالیہ پہاڑ اپنی جگہ سے سرک جائے۔ گنگا پورب کو بستے بستے پچھم کو بہنے لگے مگر خدا کی باتیں نہ کبھی ملتی ہیں اور نہ کبھی کسی کے ٹالے ٹلیں گی۔ دین تم سے چاہتا کیا ہے۔ صرف اتنی بات کہ خدا نے تم کو آدمی بنایا ہے آدمی بن کر رہو تم کو آنکھیں دیں ہیں اور دیکھتے ہو، کان دیئے ہیں اور سنتے ہو، زبان دی ہے اور بولتے ہو، غرض ہر قوت سے وہ کام لیتے ہو جو اس کے کرنے کا ہے۔ قوتوں میں سب سے قوی اور سب سے عمدہ عقل ہے۔ اس نے تمہارا ایسا کیا تصور کیا ہے کہ اس کے کرنے کا کام اس سے نہیں لیتے۔ روئے زمین پر خدا کی جتنی مخلوق ہے سب میں اعلیٰ اور افضل اور اشرف انسان ہے اور اس کی برتری اس سے ظاہر ہے کہ دوسری مخلوقات پر حکمرانی اور ان میں مالکانہ تصرف کرتا ہے۔ دیکھو انسان کی بنائی ہوئی عمارتیں اس کے بسائے ہوئے شہر اس کے لگائے ہوئے باغ، نہریں، سڑکیں، پل، ریل، تار، دخانی، بادبانی، جہاز، انواع اقسام کی کہیں۔ زندگی کے ساز و سامان مگر یہ برتری جو انسان کو استحقاقاً حاصل ہے۔ کیوں ہے۔ اس کی جسمانی قوتیں تو حیوانات کی قوتوں سے بہت ضعیف ہیں۔ مثلاً اس کی نظر سے گدھ کی نظر بہت تیز ہے۔ اس کے شامے سے شکاری کتوں کا شامہ کہیں زیادہ قوی ہے۔ وہ اگر ذائقے سے چیزوں کا صرف مزہ اچھا چانتا ہے تو بعض جانور مزے کے سوا خاصیت طبی کی شناخت بھی کر لیتے ہیں تو انائی کے لحاظ سے تو ہاتھی اور شیر وغیرہ کے سامنے وہ ایک موزعہ ضعیف سے بھی زیادہ کمزور ہے۔ پھر انسان کی بڑائی کس چیز میں ہے! عقل میں اب دیکھنا چاہیے کہ عقل کا کام کیا ہے یہ سمجھنا کہ عقل ہم کو صرف اسی واسطے دی گئی ہے کہ کھانا پینا کپڑا مکان۔ ساز و سامان بہم پہنچانے میں مدد کرے عقل کو ذلیل اور بے قدر کرتا ہے۔ یہ تو عقل کے نہایت مبتذل کام ہیں۔ جانور جن کے جنے ہمارے خوں سے بہت بہت بڑے ان کی بھوک پیاس ہماری بھوک پیاس سے کہیں زیادہ ہے۔ ہماری جتنی عقل نہیں رکھتے اور ہم سے زیادہ آسودگی کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔ ساٹھ ستر برس کی زندگی اور معدودے چند ضرورتوں کے لیے ایسی عقل جو ماضی اور مستقبل کے قلابے ملائے اور زمین سے آسمان تک پاؤں پھیلائے کسی بڑے اور عمدہ کام کے لیے دی گئی ہے اور وہ یہ نہیں ہے مگر یہ کہ مخلوق سے خالق فانی سے باقی اور دنیا سے آخرت کو پہچان کر اس گھر کے لیے تیاری کریں، جہاں روح کو ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہے لیکن فرض کرو کہ ہم ان خیالات کو اپنے ذہن میں نہ آنے دیں اور آنکھیں بند کر لیں۔ دنیا و مافیہا



سے جس کا ایک ایک ذرہ ہستی صالح اور ایک ایک واقعہ وجود سب پر دلالت کر رہا ہے۔ تو اس سے واقعات کا بظاہر تو نہیں ہو سکتا، خدا بنے اور ہمیشہ کو رہے گا۔ ہم اس کے بندے ہیں اور کسی طرح اس کے فرمان سے باہر نہیں ہو سکتے۔ ہم کو مرنا ہے اور جو کچھ دنیا میں کیا ہے اس کی جواب دہی کرنی ہے، عمل اچھے ہیں تو تسلی ہے اور امن ہے اور عافیت ہے اور سکون ہے اور قرار ہے یعنی یہ کہ بیڑا پار ہے۔ برے ہیں تو حسرت ہے اور افسوس ہے اور ندامت ہے اور پھٹکار ہے اور دھتکار ہے، یعنی یہ کہ دکھ کی مار ہے۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ اصل میں تو ہوتی ہے غفلت اور اونگھتے کو ٹھٹھاتے کا بہانہ اختلاف مذہب ہے تو جہی کا باعث ہو جاتا ہے۔ آدمی دیکھتا ہے دنیا میں کہ سینکڑوں ہزاروں مذہب ہیں ہر ایک صرف اپنے آپ کو برسر حق سمجھتا ہے۔ باقی سب کو گمراہ و کافر اور مردود اور ملعون اور جہنمی تو یہ دیکھ کر خود بخود اس کے دل میں خیال آتا ہے کہ پہلے ان ہزاروں مذاہب کے معتقدات سے واقفیت حاصل کروں پھر ان کے سوال و جواب سنوں پھر ان میں محاکمہ کروں۔ اس کے لیے میں کیا میری تو دس نسلوں کی عمریں بھی کفایت نہیں کر سکتیں۔ اس سے بہتر ہے کہ مذہب کی پہیلی کو جس کا اتنا پتا کچھ نہیں، سوچو ہی مت، لیکن یہ بھی ایک وسوسہ شیطانی ہے اور انسان کے اذہب ہونے کے لیے حجت نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں جتنے مذہب ہیں، جہاں تک مذہب کو دنیا سے تعلق ہے۔ سب کا مقصد اصلی ہے آدمی کی اصلاح۔ اور اختلاف اگر ہے تو ملکوں کی آب و ہوا لوگوں کو طبائع اور عادات اور ضرورتوں کے اختلاف کی وجہ سے فروغ میں ہے، نہ اصول میں جزییات میں نہ کلیات میں۔ پس تم جیسے نوجوان آدمیوں کے لیے اس سے بہتر اصلاح کی بات نہیں کہ جس شان میں ہے اسی شان میں رہ کر پابندی مذہب کو نہ چھوڑے۔ اس سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ نیکی کا خیال دل میں راسخ ہو جائے گا۔ خدا سے لگاؤ پیدا ہوگا۔ اور حق کی تلاش میں اس کو مزاملے گا۔ آدمی گمراہ کرے اور اس سے زیادہ کراہی کیا سکتا ہے تو ضرور خدا کی رحمت اس کی دست گیری کرے گی۔ والذین جاهدوا فینا لنھدینھم سبلنا لوگ مذہب کی طرف سے جو اس قدر غافل اور گمراہ بن رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ خدا نے اپنے بندوں کی آزمائش کے لیے دنیا کا انتظام ایسے طور پر رکھا ہے کہ دنیاوی حالات کے اعتبار سے نیک اور بد اور پابند اور اماندہی اور مومن و کافر اور محدود و شرک کسی کا کچھ امتیاز نہیں خداوند تعالیٰ کی عام رحمتوں سے سب کے سب بالاختصاص یکساں طور پر متمتع ہوتے ہیں۔ وقت پر پانی سب کے واسطے برستا ہے۔ ہوا کا ذخیرہ سب کے لیے موجود ہے۔ رزق ہر ایک کی خاطر مہیا ہے۔ صحت و مرض تناول و افلاس و الد و تناسل حیات و ممات غرض زندگانی کی بھلی بری تمام کیفیتیں جیسی مسلمانوں میں ویسی عیسائیوں میں ویسی یہود میں، کوئی قوم بلکہ کوئی گروہ بلکہ کوئی فرقہ بلکہ کوئی تنفس اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ مذہب کی وجہ سے مجھ کو دنیا میں یہ خصوصیت حاصل ہے اور کہیں ایسی ایک ادنیٰ سی خصوصیت حاصل ہے۔ اور کہیں ایسی ادنیٰ سی خصوصیت بھی پائی جائے تو آپ جانیں تمام روئے

زمین سے اختلاف مذاہب کے معدوم کر دینے کو کافی ہے۔ یہ ہی خصوصیت ان لوگوں کے حق میں رسم قاتل بنے جن کی طبیعتیں المذہبی کی طرف مائل ہیں۔ غور کرنے کی تو ان لوگوں میں عادت ہوتی ہی نہیں۔ دنیا میں ہیں اور دنیا ہی کو دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں بس جو کچھ ہے یہی دنیا ہے۔ ذالک مبلغہم من العلم لیکن ذرا عقل کو کام میں لائیں تو معلوم ہوا اور اندر سے دل آپ ہی آپ گواہی دینے لگے کہ نہیں ایک جہاں اور بھی ہے۔ یہ دنیا خواب ہے اور وہ جہاں اس کی تعبیر، مجاز ہے اور وہ حقیقت، یہ نمونہ ہے اور وہ اصل۔ جس طرح عقل دنیا سب کی یکساں نہیں۔ اسی طرح عقل دین کے مدارج بھی متفاوت ہیں۔ بعض لوگ وہ ہیں جو صرف موجودات دنیا سے خدا کو خدا سے اس کی عظمت کو اس کی عظمت سے اس کی معبودیت کو مانتے پہچانتے ہیں اور بعض موجودات سے نہیں بلکہ تغیرات سے اور تغیرات سے بھی نہیں بلکہ حادثات عامہ سے بھی متنبہ نہیں ہوتے تا وقتیکہ خود ان پر کوئی آفت نازل نہ ہو اور بعض حادثات عامہ سے حلول مصیبت پر بھی کہنے کے متمن گویا نیل ہیں کہ آ رہی کھپوؤ اور۔ ماتھ منہ سے بھی ٹٹکاری دوتب ان کو خبر ہو کہ چنا چاہیے۔ اے میرے پیارے نتیجے اے مرحوم کی یادگار اے مغفور کی نشانی مجھ کو بھائی کے مرنے کا اتنا رنج نہیں ہوا جتنا تمہارے دین کی تباہی کا۔ بھائی اگر مرے تو عمر طبعی کو پہنچ کر مرے۔ اور ایک دن مرنا ضرور تھا۔ میں نے اپنی موت کے لیے دعا تو نہیں مانگی۔ اس واسطے کہ موت کے لیے دعا مانگنا منع ہے۔ مگر سات برس عرب میں رہا کوئی دن ایسا نہیں گزرا کہ میں نے اس سرزمین میں اپنے دفن ہونے کی تمنا نہ کی ہو۔ مگر خدا کی مبارک مرضی یوں تھی کہ میں یہاں پھر آؤں اور بھائی کا مرنا سنوں جب سے میں نے بھائی کا مرنا سنا ہر روز بلکہ دن میں کئی کئی بار (دعا نہیں) دل میں تمنا کرتا ہوں کہ الہی اگر عرب کی مٹی سے میرا خمیر نہیں ہے تو مجھ کو باایمان دنیا سے اٹھا کر اس شخص کے پہلو میں مجھ کو جگہ دے جو مجھ کو دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھا۔ یعنی میرے بڑے بھائی اور تمہارے والد مرحوم۔ میں نہیں جانتا کہ یہ تمنا بھی پوری ہو یا نہ ہو مگر بھائی کے مرنے کے بعد اب زندگی بے مزہ ہے اور اس ملک میں رہنا اس سے زیادہ بے مزہ۔ یہ مت سمجھو کہ آدمیوں کے باہمی تعلقات اس زندگی تک کے تعلقات ہیں، نہیں نہیں یہ تعلقات روحی تعلقات ہیں اور چونکہ روحوں کو فنا نہیں۔ ان کے تعلقات کو بھی انقطاع نہیں۔ یقیناً جانو کہ تمہاری اس طرز زندگی سے بھائی کی روح کو ایذا ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کو اس زندگی میں بھی تمہاری تکلیف کی برداشت نہ تھی اور اس طرز زندگی کے ہاتھوں تم پر جو سخت بلا نازل ہونے والی ہے میں اس کو عقل سے جانتا ہوں اور تمہارے باپ اس کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ باپ سے ہو سکتا ہے کہ بیٹے کو کنوئیں میں گرتا ہوا دیکھے اور پروا نہ کرے باپ سے ممکن ہے کہ بیٹا جلتی ہوئی آگ میں کودے اور وہ کھڑا ہوا تماشا نہ دیکھے۔ مرحوم نے لوگوں کی نظروں میں سلامت روی اور نیک وضعی اور بھلا، منساہت سے جو ایک وقار پیدا کیا تھا تم ہی اپنے دل میں انصاف کرو کہ تم نے اس کو بڑھایا یا

گھٹایا۔ روشن کیا یا مٹایا۔ ایسے چاہنے والے ایسے شفیق ایسے مہربان دل سوز باپ کے احسانات کا یہی معاوضہ تھا۔ ان کے سلوک اسی پاداش کے قابل تھے۔ جو باتیں میں تم سے کہہ رہا ہوں، تم کو شاید پہلی بار ان کے سننے کا اتفاق ہوا ہوگا۔ مگر میری ساری عمر ان ہی غوروں اور فکروں میں گزری ہے اور اس میں اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ شروع سے مجھ کو اچھے لوگوں کی صحبت رہی۔ ہندوستان سے لے کر عرب تک ہزار با علماء اور شیوخ سے ڈھونڈ کر ملا اور جس سے جتنا فیضانِ قسمت کا تھا حاصل ہوا۔ الحمد للہ نلی ذلک۔ تم دیکھتے ہو کہ میں دین کے کاموں میں بھی جہاں تک مجھ سے ہو سکتا ہے اور افسوس ہے کہ قدر واجب کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ لگا پٹا رہتا ہوں، اس پر بھی خدا کی عظمت اور اس کے جلال پر نظر کرتا ہوں تو مجھ کو اپنی نجات کی طرف سے بالکل مایوسی ہوتی ہے اور تنہائی میں خصوصاً رات کے وقت دنیا کی بے ثباتی قیامت کے حساب اور اپنی بے بضاعتی کے افکارِ جہوم کرتے ہیں تو مجھ کو اس قدر وحشت ہوتی ہے کہ تم کو اس کا اندازہ سمجھنا مشکل ہے، صرف ان کی رحمت بے انتہا کی توقع اس وقت دست گیری کرتی ہے جس سے دل کو تسلی ہوتی ہے۔ یہ زحمت جو مجھ کو دین کے کاموں میں اٹھاتے ہوئے دیکھتے ہو۔ اگر اس کو زحمت سے تعبیر کرنا درست ہو تو اتنی مدد کرتی ہے کہ امیدواری رحمت کی ڈھارس بندھاتی ہے، اگر خدا تعالیٰ میں راستی دے تو دنیا کی سب باتوں سے دین کی تعلیم نکلتی ہے۔ دنیا میں جس کو جس پر کسی طرح کی حکومت ہے جیسے شوہر کو بی بی پر یا باپ کو اولاد یا بادشاہ کو رعایا پر اگرچہ دنیا کی ساری حکومتیں عارضی اور ضعیف ہیں۔ اس پر بھی کوئی حاکم کسی محکوم کی کسی نافرمانی سے درگزر نہیں کرتا کیا غفلتیں ہیں کیا بے فکریاں ہیں، کیا مغالطے ہیں، کیا مناسبتی ہے کہ بندہ بے حقیقت و ناچیز نافرمانی کیسی، اس قادر ذوالجلال کے اوامر کا استخفاف کرے۔ گویا اس کا مقابلہ ہے اور پھر درگزر کی توقع۔ کیا ہیکڑی ہے، مغفرت کی امید کیا ہے حیائی ہے۔ تم کو اکثر باتوں میں مغالطہ واقع ہوا ہے۔ دوستوں کے بارے میں بھی تمہاری رائے غلطی سے محفوظ نہیں رہی۔ یہ لوگ جو تمہارے آگے پیچھے پڑے پھرتے ہیں۔ اور ہر وقت تم کو گھیرے رہتے ہیں۔ جہاں تک میں نے خیال کیا ہے، ایک کو بھی تمہارا خیر خواہ نہیں پاتا، ان کے کچھ مطلب ہیں بے ہودہ اغراض ہیں فاسد۔ تم کو دیکھ پایا، عقل کے کوتاہ گانٹھ کے پورے آپ بنے شکاری اور تم کو گرداباٹی اور لگے تمہاری آڑ میں تگے چاڑنے، غرض مندانہ رابطے عموماً اور خاص کر جب کہ اغراض خسیس ہوں۔ نہایت بے ثبات ہوتے ہیں اور سرِ ایلِ الانقطاع۔ مجھ کو تو تو یہ ہے کہ تم نے خود اس کا تجربہ کر لیا ہو گا ورنہ میرا اس وقت کا کہنا چاہو لکھو تمہارے اتنے دوست ہیں ان میں سے کسی ایک کے ساتھ دو برس تک صحبت یوں ہی چلی جائے تو جاننا کہ بہت چلی خیال کو اور وسعت دونوں کا یہی حال ہے۔ دنیا کے تمام جسمانی تعلقات کا غیروں کی کیا شکایت دوسروں کا کیا گا، اپنے ہی اعضاء جو راح اپنی ہی قوتیں کب تک کی ساتھی ہیں۔ دیکھو مجھ جیسے بوڑھوں کو کہ ایک بصارت سے معذور ہے تو دوسرا نقل و سمع سے

مجبور کسی کی بھوک تھکی ہوئی ہے اور کسی کے ہاں خیمے میں فتور۔ پیری و صدیب زندہ درگور۔ دنیا کی یہی بے ثباتی دیکھ کر جن کی عقلیں سلیم ہیں، فانی لذتوں کے گرویدہ اور عارضی منفعتوں کے فریفتہ نہیں ہوتے، جس قدر میں نے تم سے کہا۔ اگرچہ ضرورت سے بہت کم کہا مگر مجھ کو تمہاری طینت کی پاکیزگی سے امید ہے کہ انشاء اللہ رائیگاں نہ جائے گا اور خدا نے چاہا تو میں دعا بھی کروں گا کہ تمہارے دل میں سوچنے اور غور کرنے کا شوق پیدا ہو مگر قاعدہ ہے کہ دنیا میں کوئی مبتذل سے مبتذل فائدہ بھی بے خطاب نہیں ملتا۔ سچ ہے کہ جب تک بچہ روتا نہیں ماں بھی دودھ نہیں دیتی پس دین کے عمدہ اور دائمی فائدے بدرجہ اولیٰ طلب پر موقوف اور پیروی پر منحصر ہونے چاہئیں اور وہ تمہارے کرنے کا کام ہے۔ دین کے کام ہیں تو دل سے متعلق اور کوئی شخص دوسرے کے خیالات یعنی دل حالات پر مطلع نہیں ہو سکتا مگر خیالات کی اصلاح سے ارادے کی اور ارادے سے اعمال کی طرز تمدن کی اور وضع کی گفتگو کی نشست برخاست کی حرکات و سکنات کی سبھی چیزوں کی اصلاح ہوتی ہے۔ یعنی انسان کا ظاہر حال اس کے دل کا ترجمان ہوتا ہے۔ پس تم کہو یا نہ کہو خود بخود منکشف ہوتا رہے گا کہ جس راستے پر میں نے تم کو لگا دیا ہے تم نے اس میں چنا شروع کیا یا نہیں۔

## بتا! پر متقی کے وعظ کا کہاں تک اثر ہوا

بتا! کو جب چچا نے پکڑ کر نصیحت کے لیے بٹھایا تھا تو خواہ مخواہ اس کی طبیعت میں از خود ایک ضد سی آگئی تھی تاہم تھوڑی دیر ادب کی وجہ سے دم نہ مار سکا اور پھر تو میر متقی کی باتوں پر ایسا رتکھا کہ آنکھیں اور منہ دونوں کے دونوں کھلے رہ گئے اور جب تک میر متقی نے بات کو ختم نہیں کیا۔ بتا! کو کوئی دیکھتا تو کیا معلوم ہوتا کہ بس حیرت کا ایک پتلا ہے۔ چچا کے پاس سے چلے جانے کے بعد بھی کئی دن تک وہ مبہوت سا رہا اس کا دل تو مان گیا تھا کہ چچا نے جو کچھ کہا ٹھیک ہے مگر جس بات کی آن پڑ گئی تھی اس کے بدلتے ہوئے اس کا جی پکچکا تا تھا۔ آوارگی اس کی طبیعت میں یہاں تک سا رہی تھی کہ ترک وضع کرتے ہوئے اس کو عار آتی تھی وہ سوچتا تھا کہ چچا کے کہنے پر چلوں تو دوست آشنا کھانا پینا سیر تماشا تفریح تمامی مشاغل سب کو ایک دم چھوڑوں یعنی ترک دنیا کروں تو پھر جیوں کیونکر اور فرض کیا کہ جبراً قہراً میں نے ترک دنیا کیا بھی تو لوگ مجھ کو کیا کہیں گے۔ آخر پر ہیز گار بنوں تو پورا پورا بنوں جیسے چچا زریفت کی ٹوپی خلاف آداب میں پہننے سے رہا۔ ناچار شملہ، دوپٹہ، عمامہ باندھنا پڑے گا اور اس کی زد میں بالوں کی جیسی گت بنے گی ظاہر ہے۔ تو ضرور ہوا کہ سب سے پہلے سر منڈاؤں منڈے سر پر یہ خشخاشی داڑھی اور چڑھی ہوئی مونچھیں کیا بھلی لگیں گی تو لازم آیا کہ ڈاڑھی چھوڑوں اور مونچھوں کو سیدھا کروں پھر ایسی مقطع صورت پر گلے میں کرتہ نہ ہو تو خیر نیچی چوٹی کا انگرکھا اور ناگوں میں ایک برکا گھٹنا اس وجہ سے کیا منہ لے کر بازار میں نکلوں گا۔ ساری عمر کبھی مسجد میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا اب جو ایک دم سے جا کھڑا ہوں تو جتنے نمازی ہیں سب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے گھوریں گے۔ غرض جن کو چھوڑتا ہوں اور جن میں جا کر ملتا ہوں سبھی کا انگشت نما ہونا پڑے گا۔ بتا! اسی پس و پیش میں تھا کہ میر متقی ایک دن اس کو وضو کراکپڑے بدلاوا اپنے ساتھ جمعہ کی نماز میں لے گئے اور اس کے بعد سے جب تک رہ نماز کو جاتے بتا! کو گھر سے ساتھ لے کر نکلتے ہیں۔ غرض بتا! کی وہ جھجک تو جاتی رہی اور اس کی وضع میں بھی رفتہ رفتہ اصلاح آتی چلی۔ اگر میر متقی کا دو تین مہینے بھی اور رہنا ہوتا تو بتا! کے درست ہو جانے میں کوئی کسر نہ تھی۔ آخر میر متقی نے کیا ہی کیا تھا بتا! کو صرف ایک وعظ سنایا۔ صرف اتنی سی کوشش کی اس کی غفلت کو تازیانہ۔ دیندار بھلا مانس بنتے ہوئے وہ جھینپتا تھا۔ اس کی شرمندگی منادی۔ اگر زیادہ رہنے کا اتفاق ہوتا تو خدا جانے کتنے وعظ اور کہتے اور کیا کیا اس کو سکھاتے سمجھاتے وہ تو اچھی طرح جانتے تھے کہ برسوں کے جے ہوئے زنگ ہیں یہ کیا رگڑے سے چھوٹنے والے ہیں۔ حسن پرستی کا وہ بڑا سخت مہیب بھی گویا بتا! کی گھنٹی میں داخل تھا۔ میر متقی موقع پا کر اس کا علاج کرتے کرتے مگر بتا! کو تو اپنے اعمال کی شامت بھگتنی تھی۔

میر منتی کا دفعتاً بے وقت رام پور روانہ ہونا اور بتانا کو سید حاضر اور عارف کے سپرد کر جانا

میر منتی نے بتانا کی اصلاح پر توجہ شروع کی تھی کہ اتنے میں چپکے چپکے اس گمنام عرضی کی تحقیقات ہونے لگی جو ناظر کی شرارت سے میر منتی کی شکایت میں گورنر کے پاس پہنچی تھی اور تو کچھ حال نہ کھلا مگر خلاف عادت پولیس کے لوگ وقت بے وقت کوئی وعظ سننے کے بہانے سے کوئی نماز کے حیلے سے آمد و رفت کرنے لگے ان میں جو زیادہ ہوشیار تھے پتے دے دے کر میڑھے میڑھے مسئلے پوچھتے تھے۔ مثلاً یہ کہ کیوں حضرت ہندوستان آپ کے نزدیک دارالحرب بنے یا نہیں۔ انگریزوں سے اور ہندو سے سود لینا روا بنے یا نہیں۔ انگریز اگر کابل پر چڑھائی کریں اور ایک پلٹن کو امیر کے مقابلے میں لڑنے کا حکم دیں اور ایک مسلمان اس پلٹن میں پہلے سے نوکر ہو تو اس کو کیا کرنا چاہیے۔ مہدی جنہوں نے مصر میں خروج کیا بنے مہدی موعود ہیں یا نہیں اور ان کو مدد دینا از روئے شرع شریف کیا حکم رکھتا بنے۔ انگریزی دواؤں کا استعمال درست بنے یا نہیں، کچہری سے برابر سود کی ڈگریاں ہوتی ہیں۔ اس سود کا دینا گناہ بنے یا نہیں۔ انگریزوں کے ساتھ کھانا اور لباس اور طرز تمدن میں ان کے ساتھ شبیہ کیا حکم رکھتا بنے۔ میر منتی جہاں دیدہ آدمی تھے۔ ان باتوں کو دیکھ کر ان کے کان کھڑے ہوئے اور سمجھے کہ ضرور دال میں کچھ کالا بنے۔ کوٹوال شہر سے معرفت اور دور کی صاحب سلامت تو تھی ہی۔ ایک جمعہ کی نماز کو جاتے ہوئے راہ میں کوٹوال سے آمناسا منا ہو گیا۔ میر صاحب نے کہا مجھ کو آپ سے کچھ کہنا بنے۔ وقت فرصت معلوم ہو تو میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ کوٹوال نے کہا آج بعد نماز مغرب میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ غرض کوٹوال کے ساتھ تخلیہ ہوا تو میر صاحب نے فرمایا کیوں کوٹوال صاحب یہ کیا ماجرا بنے کہ چند روز سے پولیس کے لوگ میری نگرانی کرنے لگے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ جتنی دیر میں باہر رہتا ہوں پولیس کا ایک نہ ایک آدمی ضرور موجود ہوتا بنے مسئلے پوچھتے ہیں تو بیچ دار باتیں کرتے ہیں تو اکھڑی ہوئی میں نے دھوپ میں ڈاڑھی سفید نہیں کی۔ یہ لوگ مجھ سے چھپاتے ہیں اور میں سب سمجھتا ہوں، مجھ سے پردہ کرتے ہیں اور میں ان کے تیور پہچانتا ہوں۔ آپ کو معلوم بنے میں یہاں کارہنہ والا نہیں۔ سات برس بعد سفر حجاز سے واپس آیا۔ رام پور جانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا کہ آؤ لگے ہاتھ بھائی سے ملتا جاؤں، یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ بھائی کا انتقال ہو چکا بنے، ان کے معاملات خانہ داری کو دیکھا۔ سب کے سب اترنا چار ٹھہرنا پڑا۔ اکثر معاملات خدا کے فضل سے درست ہو گئے ہیں۔ بعض باتیں باقی ہیں۔ اگر میرے حال سے تعرض نہ بھی کیا جائے۔ تاہم تین چار مہینے سے زیادہ ٹھہرنا منظور نہیں اور ٹھہر سکتا بھی نہیں۔ لیکن اس نظر بندی کی حالت میں تو میں ایک دن بھی نہیں رو سکتا، بے اطمینانی کی وجہ سے وہ مطلب بھی فوت ہو جاتا بنے جس کی وجہ سے ٹھہرا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے

سرکار کا ایسا کون سا قصور کیا ہے۔ درس میں نہیں دیتا کہ میرے پاس مجمع رہنے خطایا قصور اگر ہے تو یہی کہ جو اللہ کا بندہ پاس آ بیٹھتا ہے تو نصیحت کی دو چار باتیں اس سے کہہ دیتا ہوں اور یہ کام ایسا ہے کہ دنیا کی حکومت کیسی ہی طاہر کیوں نہ ہو مجھ کو اس سے باز نہیں رکھ سکتی۔ نصیحت تو لوگوں کو میں نے کی ہے اور کرتا ہوں اور آئندہ بھی جہاں رہوں کروں گا۔ ضرور کروں گا، اگر یہ بغاوت ہے تو میں پکارے کہتا ہوں کہ میں باغی۔ سرکار کو اختیار ہے مجھے قید کرے مگر انشاء اللہ وہاں بھی قیدیوں کو نصیحت کرتا رہوں گا۔ سرکار شہنشاہِ زبردست اور میں اس کی ایک ادنیٰ رعیت، میرے واسطے ایسی کارروائی کی کیا ضرورت ہے۔ اگر کچھ اشتباہ پیدا ہوا ہے تو مجھ کو غلطی روس الا شہاد طلب کرے میں جواب دہی کو اور اگر قصور ثابت ہو تو سزا کو حاضر ہوں مگر اپنا جس کی نظر میں ناحق ٹکوبانا مشتبہ ٹھہرانا شیوہ انصاف سے بہت بعید ہے۔ کتوال یہ سب باتیں چپ چاپ بیٹھا ہوا سنتا رہا اور آخر بولا تو یہ بولا کہ میں ارادہ مند نہ اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ جب حضرت کا ارادہ تین چار مہینے بعد خود رام پور روانہ ہونے کا ہے۔ اگر ابھی قصد فرمائیے تو مناسب ہے۔ یہاں کا اگر کوئی کام مجھ کو سپرد کر جائیے۔ انشاء اللہ اس کا سرانجام خاطر خواہ میرے ذمے۔ میری منتی نے سمجھا کہ اب ٹھہرنا مصلحت نہیں اور زیادہ کاوش کرنے سے بھی حاصل نہیں فوراً سفر رام پور کا ارادہ کر دیا۔ غیرت بیگم باپ کے مرنے پر تو کیا روئی تھی جیسا کہ چچا کے جانے کا اس نے ماتم کیا۔ بتانا کے خیالات میں بھی تھوڑے ہی دنوں میں اتنا فرق پڑ گیا تھا کہ اس کو بھی چچا کے چلے جانے کا رنج ہوا۔ میری منتی نے ہر ایک کو اس کی جگہ تسلی دی۔ چلتے چلتے بتانا سے اتنا کہہ گئے کہ سید حاضر کے خیالات بہت راستے پر آ گئے ہیں۔ اگر تم ان سے مشورہ لو گے تو امید ہے کہ نیک صلاح کے دینے میں دریغ نہ کریں گے یا میاں عارف جن کو تم میرے پاس اکثر دیکھتے تھے تمہارے ہی مدرسے کے طالب علم ہیں۔ بڑے اچھے دل کا لڑکا ہے، بے تو تمہارا ہم عمر مگر استعداد اور معلومات کے اعتبار سے پورا مولوی ہے، بڑی خوبی اس میں یہ ہے کہ اس کے خیالات حکیمانہ اور شگفتہ ہیں۔ میں نے اس سے بھی بہ تاکید کہہ دیا ہے اور وہ ہفتے میں ایک دو بار تمہارے پاس آیا کریں گے۔ تم بھی رابطہ بڑھالینا ان سے تم کو ہر طرح مدد ملے گی۔

## میر متقی کے چلے جانے کے بعد بتا! کس رنگ میں رہا

بتا! کی تو اس وقت بعینہ اسی مثال ہو گئی کہ ایک مریض مرض مہلک میں گرفتار ایک طبیب حاذق نے اس کا علاج شروع کیا ارادہ تھا کہ منفعہ ہوں۔ منجوں کے بعد مسہل۔ مسہلوں کے بعد تبرید معونات کا استعمال کرایا جائے۔ ابھی منفعہ بھی پورے نہ ہونے پائے تھے کہ طبیب صاحب تشریف لے گئے۔ سید اگرچہ اس کا پھوپھی زاد بھائی تھا مگر رشتہ داری کے جھگڑوں کے سبب ایک دوسرے کے ساتھ انس نہ تھا۔ رہ گئے میاں عارف مولوی تھے حکیم تھے شگفتہ خیال تھے سب کچھ تھے مگر بتا! کے چچا نہ تھے۔ بتا! کو ان کا کیا لحاظ اور ان کو بتا! کا کیا درد پھر بھی بے چارے نے خدا ان کو جزائے خیر دے۔ میر متقی کے کہنے پر اتنا تو کیا کہ پیر کے پیر سے کے سے بتا! کے پاس آتے اور گھنٹے دو گھنٹے بیٹھ کر چلے جاتے، اسی طرح بتا! بدھ کے بدھ اور اتوار کے اتوار عارف کے گھر جاتا اور یوں ایک دن بیچ دونوں کی ملاقات کا سلسلہ بندھ گیا۔ اس سے اتنا تو ہوا کہ بتا! کے پرانے یار اور دوستوں کو اس پر احاطہ کرنے کا موقع نہ ملا اور جس دھڑے لپر چچا نے اس کو لگا دیا تھا اس پر تھوڑا چلا ست چا بدیر چلا۔ دین داری میں اگر سچ پوچھو تو بتا! نے ترقی نہیں کی مگر اس کا سنبھال رہنا بھی غنیمت ہوا کہ پھر اس نے آوارگی نہیں کی وہ نماز بھی پڑھ لیتا تھا مگر گنڈے دار۔ اب دین کی باتوں کا اگر اہتمام نہیں کرتا تھا تو پہلے کی طرح ان پر ہنستا بھی نہ تھا اس کی ظاہر وضع میں بھی اگلی سی سخاوت باقی نہ تھی۔ جب سے باپ مرے اس نے گھر میں سونا بالکل چھوڑ دیا۔ چچا کے آنے سے وہ پھر گھر میں سونے لگا تو ان کے چلے جانے کے بعد وہی معمول رکھا۔ غرض بتا! دین دار نہیں تو ایک خانہ دار بھلا آدمی بن گیا تھا جیسے اکثر لوگ ہوتے ہیں مگر حسن پرستی کی ہڑک ہر روز دو ایک بار اس کو ابھرتی رہتی تھی۔



## حسن صورت پر بتانا اور عارف کا مباحثہ

ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ عارف کے آنے کا وقت تھا اور بتانا بیٹھا ہوا ان ہی کی راہ دیکھ رہا تھا بیٹھے بیٹھے اسی حسن پرستی کے خیال میں ایسا محو ہوا کہ عارف سر پر آکھڑے ہوئے اور اس نے عادت کے مطابق نہ تو ان کا استنبال کیا اور نہ کھڑے ہو کر ان کو تعظیم دی۔ جب عارف نے جبک کر السلام علیکم کہا تب سٹ پٹا کر کھڑا ہونے لگا۔ مگر عارف بیٹھ چکے تھے۔ انہوں نے ہاتھ پکڑ کر اپنے برابر بیٹھالیا اور پوچھا کہ خیر ہے آج کس خیال میں مستغرق تھے بتانا نے ٹالنا چاہا۔

عارف: (نے اصرار کیا) نہیں کوئی بات تو ضرور ہے جس کو تم اس قدر غور کے ساتھ سوچ رہے۔

بتانا: غور کے بارے میں تو چچا نے مجھ پر بڑی سخت تاکید کی ہے۔

عارف: بلاشبہ ان کا فرمان درست ہے۔ غور کے معنی کیا ہیں۔ عقل سے کام لینا اور انسان نے اگر عقل ہی سے کام نہ لیا تو اس میں اور دوسرے حیوانات میں کوئی مابہ امتیاز نہیں، مگر پوچھنے سے میری غرض یہ تھی کہ اگر وہ بات مجھ پر ظاہر ہو تو جہاں تک مجھ سے ممکن ہو تمہاری مدد کروں۔ تمہارے چچا نے جن کو میں اپنے والد کی جگہ سمجھتا ہوں تم سے غور کرنے کو کہا اور مجھ سے تمہاری مدد کرنے کو۔ پس تم اگر ان کے کہنے کے غور کرتے ہو تو ان ہی کے ارشاد کے موافق مجھ سے مدد بھی او۔

بتانا: جس بات کو میں سوچ رہا تھا اکثر سوچا کرتا ہوں مگر ابھی تک کچھ سمجھ میں نہیں آیا تاہم اتنا تو جانتا ہوں کہ آپ سے اس میں کچھ مدد ملنے کی توقع نہیں۔“

عارف: ”جب تک تم اس بات کو مجھ سے بیان نہ کرو اور میں جواب نہ دے دوں کہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ اس وقت تک تم کو میری مدد سے ناامید ہونے کا کوئی محل نہیں۔“

بتانا: اچھا تو آپ مدد کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔

عارف: اجی تم سے کیا وعدہ کروں گا میں تو وعدہ کر چکا ہوں جناب میرا منتفی صاحب سے۔

بتانا: ”اس خاص بات کا اس وقت تک کچھ مذکور نہ تھا۔“

عارف: مجھ سے جناب میر صاحب نے کسی بات کا ذکر نہیں کیا۔ عام طور پر تمہاری مدد کرنے کو فرمایا اور میں نے اس کو تسلیم کیا۔ اس سے بڑھ کر اور وعدہ کیا ہوگا

بتانا: آپ کو میرے خانہ داری کے حالات معلوم ہیں۔

عارف: جس قدر حالات جناب میر صاحب کو معلوم تھے مجھ کو بھی معلوم ہیں۔

بتنا: چچا باوانے آپ سے میری خانداری کے بارے میں کبھی کچھ کہا تھا

عارف: اکثر اس بات کا سخت افسوس کیا کرتے تھے کہ بی بی کے ساتھ تمہارا معاملہ درست نہیں۔

بتنا: تا درستی معاملہ سے ان کی کیا مراد تھی۔

عارف: مراد یہ تھی کہ تم کو بی بی کے ساتھ انس نہیں محبت نہیں۔

بتنا: بھلا اس کا کچھ سبب بھی انہوں نے بیان کیا تھا۔

عارف: ہاں یہ فرماتے تھے کہ تمہارے مزاج میں آوارگی ہے۔ حسن پرستی کے مزے پڑے ہوئے ہیں، دل میں یہ خط

سار ہا ہے کہ میں حسین ہوں، بی بی نظروں میں بھرتی نہیں۔

بتنا: کیا چچا باوا اس بارے میں بھی کچھ کرنے کو تھے۔

عارف: بے شک فرماتے تھے کہ مطالب کو تو میں نے اپنے ذہن میں ترتیب دے لیا ہے۔ اب موقع کی تاک میں

ہوں۔

بتنا: شاید ان کا ارادہ تھا کہ اس پر بھی کوئی وعظ کہیں مگر بھلا ہوا اس کی نوبت نہ آئی ورنہ چارو ناچار مجھ کو مخالفت کرنی پڑتی۔

عارف: کچھ تم نے پہلے وعظ کی مخالفت کی ہوگی کہ اس کی کرتے۔

بتنا: پہلے وعظ میں چچا باوانے کسی بات میں واقعات کی مخالفت نہیں کی۔ اس سے میں نے ان کی مخالفت نہیں کی، مگر میری

سمجھ میں نہیں آتا کہ خوبصورتی کے بارے میں وہ کہتے تو کیا کہتے۔

عارف: یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ کیا کہتے مگر اتنا انہوں نے ضرور کہا تھا کہ جس قدر اس کو حسن کے ساتھ فریفتگی ہے

انشاء اللہ اسی قدر نفرت کرنے لگے تو سہی۔

بتنا: (چونک کر) میں اور حسن سے نفرت تو یوں کہیں کہ میرے سر سے دماغ کو اور دماغ سے عقل کو اور عقل سے سلامت کو

سب کو سب کر لینے کی فکر میں تھے۔ بھلا آپ چچا باوا کے اس ارادے کی نسبت کیا خیال کرتے ہیں؟

عارف: میں تو جناب میر صاحب کی شان کو اس سے بہت ارفع سمجھتا ہوں کہ غلط بات ان کے منہ سے نکلے یا ان کے کلام

میں مبالغہ ہو۔ ان کو خدا نے علم کی، دینداری کی، خلوص کی، خیر خواہی خلق کی، گویائی کی بہت سی قوتیں دی ہیں۔ میرا عقیدہ تو

یہ ہے کہ انہوں نے چھٹانک بھر کو کہا تو من بھر کر دکھاتے۔ مگر افسوس ہے کہ یکا یک ان کا چہنما ٹھہر گیا۔

بتنا: آپ بھی تو ان کے شاگرد رشید ہیں۔ حسن سے نفرت نہیں تو خیر اتنا کیجئے کہ کسی طرح میری یہ شورش تو فرو ہو کہ مجھے اس

تصور میں نہ رات کو نیند ہے نہ دن کو قرار ہے۔ یہ کیا با! میرے سر پر سوار ہے۔

عارف: کبھی تم نے اس بات پر غور کیا ہے کہ حسن کیا چیز ہے۔ اور لوگوں کو اس قدر فریشتگی حسن کے ساتھ کیوں ہے۔  
 بتا: یہ تو کوئی غور کرنے کی بات نہیں ہے۔ مرد، عورت، بوڑھا، جوان، شہری، دیہاتی، خواندہ، ناخواندہ ہر شخص جانتا اور سمجھتا ہے کہ خوبصورتی اس کو کہتے ہیں۔ تفصیل پوچھئے تو تمام شاعروں نے معشوقوں کے سراپا لکھے ہیں۔ آپ کی نظر سے بھی تو ضرور گزرے ہوں گے۔ رضا کنہوی کا سراپا مرتع خوبی میرے نزدیک سب سے بہتر ہے۔ اس سراپا میں کئی باتیں خاص ہیں۔ اول تو سر سے لے کر ناخن پا تک کسی عضو کو نہیں چھوڑا۔ دوسرے مردوں کا سراپا الگ ہے اور عورتوں کا الگ۔ تیسرے اعضاء کی ساخت کے علاوہ ان کی حرکات کی خوبیاں بھی بیان کی ہیں۔ چوتھے حسن خلتی اور حسن مصنوعی کا تفرقہ بڑے عمدہ طور پر دکھایا ہے۔ غرض جو کچھ شعراء کے سراپاؤں میں ہے وہی حسن ہے۔ اور یہ جو آپ نے پوچھا کہ لوگوں کو اس قدر فریشتگی حسن کے ساتھ کیوں ہے تو یہ میرے نزدیک انسان کی طبیعت کا خاصہ ہے اور اس کے واسطے سوائے اس کے کہ آدمی کی طبیعت ہی خلتی حسن کی طرف راغب واقع ہوئی ہے اور کوئی وجہ درکار نہیں۔ آپ کا یہ سوال بجنہم اتی طور کا ہے جیسے کوئی پوچھے کہ کہر باگھاس کو اور مقناطیس او بنے کو کیوں کھینچتا ہے۔ آگ کیوں جاتی ہے۔

عارف: شعراء نے جو خیالات سراپاؤں میں ظاہر کئے ہیں۔ آپ کو سمجھ میں آتا ہے کہ ان کا ماخذ کیا ہے۔

بتا: میرے نزدیک ان تمام خیالات کا ماخذ وہی طبیعت انسانی ہے جو حکم کرتی ہے کہ اس عضو کو اس وضع اور اس ساخت اور اس انداز کا ہونا چاہیے۔

عارف: ہاں۔ لیکن اگر یہ خیالات طبعی ہوتے تو ضرور تھا کہ سب آدمیوں کے ایک ہی طرح کے ہوں۔ کیونکہ آدمی انسانیت میں سب یکساں ہیں تو اس کے یہی معنی ہیں کہ طبیعت انسانی سب میں یکساں ہے اور طبیعت یکساں ہوتی تو چاہیے کہ سب کے تقاضے یکساں ہوں۔ مگر ہم دیکھتے ہیں جو ایک کے نزدیک مطبوع ہے۔ دوسرے کے نزدیک مکروہ۔ مثلاً بڑی خوبصورتی رنگ کی ہے۔ کہتے بھی ہیں ایک رنگ ہزار ڈھنگ۔ لیکن رنگ کے بارے میں مذاق اس قدر مختلف ہیں کہ گورا، سرخ و سفید، گندم گوں، ملیح، چمپئی وغیرہ کتنی قسم کے رنگ ہیں۔ جن کے پیچھے ہمارے ملک کے لوگ سرد مہنتے ہیں۔ لیکن فرض کرو کہ ان رنگوں میں سے کسی رنگ کا آدمی افریقہ میں جانکلے تو وہاں اس کی کیسی قدر ہوگی جیسی کہ ہمارے یہاں جذامی کی مایمروس کی۔ افریقہ کے باشندے بھی آدمی ہیں ان کی طبیعتوں میں بھی ایسے ہی جوش اور ایسے ہی ولولے پائے جاتے ہیں۔ عشق و محبت ان میں بھی ہے۔ ان میں بھی حسین ہیں مگر ان کے سراپا تمہارے سراپا سے بالکل مختلف خاص خاص اعضاء کی نسبت بھی مذاقوں کے اختلاف کا یہی حال ہے۔ ہم پسند کرتے ہیں بالوں کی سیاہی جس کو ہمارے شعراء تشبیہ دیتے ہیں شب دیجور سے، کالی گھٹا سے، مارسیاہ سے، عاشق کی تیرہ بختی سے، ظلمات سے، اور ابل یورپ چاہتے

ہیں بھورے سے بال سونے سے ہم رنگ اور وہ بھی ہندوستان کا نہیں۔ کیلینور: یہ لکھنؤ کا پتیلی۔ ہم ڈھونڈتے ہیں آنکھوں میں چور جس کی پتلی سیاہ ہو۔ صاحب لوگ نیلی کرنجی۔ چینیوں کی نسبت مشہور ہے کہ کمائیاں چڑھا چڑھا کر ناک کو بٹھا چھوڑا کیونکہ ان کے نزدیک ناک کی اٹھان سے چہرہ ناہموار ہوتا تھا۔ عورتوں کے پاؤں کو کیسا شکنجے میں کسا کہ کھڑے ہونے سے ان کا مرکز ثقل ہی ٹھکانے پر نہیں رہتا۔ ناچار گر گر پڑتی ہیں۔ ہمارے یہاں دانتوں کا وصف بے صفائی اور چمک۔ چینیوں میں تیرگی اور سیاہی۔ افریقہ میں عورتیں دانتوں کو سوہن کر کے آڑے کا ہم شکل بناتی ہیں۔ انگریز نیاں۔ ساری دنیا کی عورتوں پر ہنسی ہیں۔ کسی کے گبنے پر، کسی کے لباس پر، کسی کے پاؤں کی بندش پر، کسی کے بناؤ سنگھار پر اور خاص کر چینیوں پر اور ان کا کہنا یہ ہے کہ انسان کی اصلی خوبصورتی اس کی قدرتی بناوٹ میں ہے۔ اگر جس وقت اپنی بہنوں پر جو دوسرے ملکوں کی رہنے والیاں ہیں ہنسی ہے، ان کو اپنی کمریاؤں میں رہتی۔ مختلف ملکوں کی تاریخیں اور جغرافیہ پڑھو تو معلوم ہو کہ حسن کی نسبت لوگوں کے خیالات کس قدر مختلف ہیں۔ قومی اختلاف سے اکثر شخصی اختلاف پر آؤ تو ہر جگہ وہی معاملہ ہے۔ کہ لیلیٰ راجپشتم مجنوں کا دیدار غرض جہاں تک غور کیا جاتا ہے حسن کا کوئی مفہوم نہیں ٹھہرتا۔ پس مفہوم حسن کو انسان کا طبعی خیال سمجھنا غلط ہے۔ بلکہ وہ ایک شخصی خیال ہے۔

بتاؤ: یہ تو ایک لفظی بحث ہے۔ حسن کی نسبت میرا خیال طبعی اور شخصی ہو تو نتیجہ واحد ہے کہ مجھ سے بدوں حسن کے صبر نہیں ہو سکتا۔

عارف: واو واو لفظی بحث کی بھی خوب کہی۔ اجماعی حضرت یہ تو علم الاخلاق کا ایک بڑا ضروری مسئلہ ہے۔ جتنی باتیں طبعی ہیں یعنی تقاضائے طبیعت انسانی سے سرزد ہوتی ہیں۔ کسی کے رو کے رک نہیں سکتیں۔ ان کی تبدیلی میں کوشش کرنا محض حاصل ہے اور مطلق بے سود۔ مگر جن کو میں نے شخصی سے تعبیر کیا ہے ضرورتیں ہیں ادعائی حاجتیں ہیں تکلفی جن کو آدمی عموماً نہیں بلکہ افراد خاص اپنے اوپر لازم کر لیتے ہیں۔ اگرچہ ان ادعائی ضرورتوں کا تقاضا کبھی ضرورتوں سے بھی زیادہ سخت ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی چونکہ تقاضائے طبیعت نہیں ہے اس کی شورش کو فرد اس کی تیزی کو مدہم کرنا ممکن ہے۔ مثلاً مطلق کھانا پینا تقاضائے طبیعت انسانی ہے اور کسی تدبیر سے یہ خواہش دفع نہیں ہو سکتی۔ مگر خاص قسم یا خاص ذائقے یا خاص کیفیت کے کھانے کا التزام تقاضائے طبیعت انسانی سے خارج ہے۔ جو لوگ شراب یا فیون یا مدک یا چنڈو یا گانجے یا چرس یا تازی یا حقے یا کسی قسم کے نشے کی عادت ڈال لیتے ہیں اس کی طلب میں ایسے بے قرار ہو جاتے ہیں جیسے بھو بھل میں مچھلی۔ تاہم یہ ایک ضرورت ہے جس کو ان کی طبیعت شخصی تقاضا کرتی ہے نہ طبیعت انسانی۔ اسی طرح خداوند تعالیٰ کی حکمت کاملہ نے نوع انسان کے باقی رہنے کے لیے ایک قاعدہ ٹھہرا دیا ہے کہ دو طرح کے آدمی بنائے۔ مرد اور عورت اور

دونوں کے لیے عمر کا ایک وقت مقرر کر دیا کہ جب اس حد پر پہنچیں تو دونوں میں از خود ایک دوسرے کی طرف رغبت پیدا ہو۔ بس یہاں تک اور صرف یہیں تک تقاضائے طبیعت انسانی ہے۔ جسے مطلق غذا اور اس سے بڑھ کر کہ جس طرح رغبت کرتا ہے، پورا یا ادھورا رند کے سراپا کا مصداق ہو کر از قبیل نشہ ہے۔ اور جہاں انسان کے اور ہزار باغویات ہیں کہ شاید دس ہزار آدمیوں میں ایک بھی ان سے محفوظ نہیں۔ ایک طرح کی اغویت حسن پرستی بھی ہے۔ بھلا کوئی مجھ کو اتنا تو سمجھا دے کہ طبیعت انسانی جس رغبت کا تقاضا کرتی ہے۔ اس سے اور رند کے یا کسی دوسرے شاعر کے سراپا سے کیا مناسبت۔

ہوتا: میں ایسا سمجھتا ہوں کہ اسی رغبت میں جس کا طبعی ہونا آپ تسلیم کرتے ہیں، سراپا کو ایسا مدخل ہے جیسا غذا میں مسالے کو۔

عارف: بالکل غلط۔ مسالہ جزو غذا ہوتا ہے۔ داخل غذا اور خود غذا نہیں

ہوتا: حسن کی نسبت آپ کی رائے تمام دنیا کی رائے کے خلاف ہے۔ اور اگرچہ بادی النظر میں آپ کی دلیل لا جواب معلوم ہوتی ہے۔ مگر چونکہ فی الواقع ایک عالم فریفتہ حسن ہے۔ اور ازاں جملہ میں بھی ہوں گو آپ کو قائل نہ کر سکوں۔ تاہم دل ہے کہ حسن کے تصور سے پکھلا جاتا ہے۔

عارف: اگر دنیا عبارت ہے ان لوگوں سے جن کو تمہاری طرح حسن پرستی کا خطبہ ہے تو بلاشبہ تمہارا کہنا درست ہے مگر زیادہ نہیں تو اپنی ہی معرفت کے مثلاً دس گھر معین کرو اور دیکھو کہ ان میں کتنے آدمی ہیں پھر ان میں اپنے جیسے عادی مزاج منتخب کرو تب تم کو معلوم ہو کہ جنون عشق عالمگیر ہے یا نہیں اور ایک بات میں تم سے اور بھی کہتا ہوں کہ یہ تمام خرمستیاں پیٹ بھرے کی ہیں۔ ایک دوسرے یہ روگ اکثر شہریوں ہی کو بوتے دیکھا اور تم نے اپنے دل کا جو حال بیان کیا اس کو میں مانتا ہوں لیکن برامت ماننا۔ مدرسے کے تمام طالب علموں میں تم سب سے زیادہ معروف مشہور تھے مگر کس بات میں مدرسے کے چند آوارہ اور بد وضع نوجوان لڑکے تمہاری محبت کا دم بھرتے تھے اور انہوں نے گفتار سے کردار سے یہ بات تم پر ثابت کر دی تھی کہ تم بھی حسین ہو۔ آدمی فرہہ شود از راہ گوش سنتے سنتے وہ خیال تمہارے ذہن میں راسخ ہو گیا۔ جب خود جوان ہوئے اس خیال کا پیرایہ بدل گیا۔ شمر۔

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی ایک اور شخص پر  
بارے ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

ہوتا: آپ مولوی ہو کر آداب مناظرہ کا لحاظ نہیں رکھتے۔ آپ کا دعویٰ یہ ہے کہ حسن کی نسبت لوگوں کے خیالات طبعی نہیں بلکہ شخصی ہیں اور اس دعویٰ کے اثبات میں آپ میری خاص حالت سے استدلال کرتے ہیں۔ دعویٰ عام ہے اور دلیل

خاص دنیا میں ہزار ہا آدمی حسن پرست ہیں تو کیا سب کی حسن پرستی کا یہی سبب ہو سکتا ہے۔ کہ میری طرح وہ بھی حسین ہیں

عارف: تم نے اچھی طرح خیال نہیں کیا۔ جیسا میرا دعویٰ عام ہے۔ ویسی ہی میری دلیل بھی عام ہے۔ اور تمہارا تذکرہ تمثیلاً تمنا نہ استدلالاً۔ میری دلیل یہ ہے کہ حسن کی نسبت مختلف ملک کے باشندوں اور مختلف قوموں اور مختلف شخصوں کے مذاق مختلف ہیں اور اگر طبعی ہوتے تو مختلف نہ ہوتے۔

بتنا: آپ کی دلیل کا خاصہ یہ ہے کہ امتزعات طبیعت انسانی تمام دنیا میں یکساں ہیں۔ مگر میرے سمجھنے میں تو یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی۔ میں دیکھتا ہوں کہ روئے زمین کے مختلف قطعات میں مختلف طور کی آب و ہوا اور مختلف طور کی پیداوار ہے۔ اور آب و ہوا اور پیداوار کے اختلاف سے باشندوں کے طبائع کا مختلف ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ بعض ملکوں کے لوگ آرام طلب ہوتے ہیں اور بعض کے جفاکش۔ بعض کے غصیلے زور درنج بعض کے متحمل بردبار، بعض کے بہادر دلیر بعض کے بزدل ڈرپوک بعض کے سیدھے۔ مادھے بعض کے مغد چالاک اور بائیں ہمہ اختلافات یہ سب خصائص طبعی سمجھے جاتے ہیں۔ اسی طرح حسن کی نسبت لوگوں کے مذاق ہوں۔ مذاق حسن پھر بھی طبعی ہی کہا جائے گا۔

عارف: جن خصائص کے اختلاف پر تم مذاق حسن کے اختلاف کو قیاس مع التماثل کرتے ہو وہ خصوصیات طبعی اور کیمیائی اثر کرتی ہے۔ گرم ملکوں کے لوگوں کے مسامات کشادہ، خون گرم اور رقیق اور اس کی گردش تیز اور سرد ملکوں میں اس کے بالکل خلاف اور یہی وجہ ہے کہ گرم ملکوں کے لوگ آرام طلب غصیلے اور بزدل اور ذہین ہوتے ہیں۔ لیکن آب و ہوا کو اس طرح کا مدخل مذاق حسن میں بنو نہیں سکتا اور اگر ہے تو اس کا ثابت کرنا تمہارا کام ہے۔ ہاں اگر یہ کہو کہ بعض گرم ملکوں کے لوگوں میں تو الد تناسل کی رغبت جلد پیدا ہوتی ہے یا وہ لوگ اس رغبت پر زیادہ حریص ہوتے ہیں تو میں اس کو مانتا ہوں۔ کیونکہ مطلقاً اس رغبت کا طبعی ہونا مجھ کو تسلیم ہے، رہی غلج اور حرص دونوں حرارت کے آثار کیمیائی ہیں۔ مگر پھر کر وہی بات آئی کہ اس رغبت طبعی کو شاعروں کے سراپا سے کہ وہی حسن ہے۔ کیا تعلق۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی شخص دوسرے شخص کے کسی عضو کو بسبب بے غرض بے مطلب کیوں اچھایا برا کہہ سکتا ہے۔ مثلاً تمہارے ناک سے اگر کسی کی کوئی غرض متعلق ہو سکتی ہے تو وہ تم ہی ہو کہ تم اس سے سوگھتے یا سانس لیتے ہو۔ اگر تمہاری ناک تمہارے کام اچھی طرح دیتی ہے تو وہ اچھی ہے مگر تمہارے لیے۔ میرا کون سا مطلب تمہاری ناک سے امکا ہے۔ کہ میں اس کو اچھایا برا سمجھوں اور یہی حال ہے تمام سراپا کا جس کے پیچھے رند نے جز کے جز سیاہ کئے ہیں۔ غرض تم کو دو باتیں ثابت کرنی چاہئیں۔ اول یہ کہ مذاق حسن تقاضائے طبیعت انسانی ہے۔ دوسرے یہ کہ الد تناسل کی رغبت طبعی میں اس کو مدخل ہے۔

بتانا: تبھی تو میں اس بات کو سوچ رہا ہوں کہ لوگوں میں مذاق حسن مختلف کیوں ہیں۔

عارف: میں نے ان باتوں کو برسوں سوچا ہے۔ آخر اس بات سے دل کتنی ہو گئی کہ حسن صورت فی نفسہ کوئی چیز نہیں پھر یہ خیال پیدا ہوا تو کہاں سے پیدا ہوا۔ پہلے ذہن اس طرف منتقل ہوا تھا کہ شاید حسن کا ماخذ علم قیافہ ہو یعنی انسان کی روح اور جسم میں ایک تعلق ہے ایسا کہ اعضاء کی ساخت اور وضع سے اس کے دلی خیالات اور اخلاق پر استدلال کیا جاتا ہے۔ لوگوں نے تجربے سے اس تعلق کو دریافت کر کے جمع کیا تو علم قیافہ مدون ہو گیا۔ جو لوگ علم قیافہ کے بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ آدمی کے اعضاء کی بناوٹ سے اس کے خصائص طبیعت کو پہچان جاتے ہیں۔ عجب نہیں کہ اعضاء کی جو وضع محاسن اخلاق پر دلالت کرتی ہو۔ اس کو اچھا سمجھنے لگے ہوں۔ لیکن جن لوگوں کے حسن کا بڑا چہ چاہے۔ ان کو دیکھا تو من حیث الاخلاق سب سے بدتر پایا۔ معلوم ہوا کہ علم قیافہ تو حسن کا ماخذ نہیں ہو سکتا۔ آخر غور کرتے کرتے یہ بات سمجھ میں آئی کہ جس طرح اب لوگوں میں اعلیٰ اور ادنیٰ اور شریف اور ضعیف اور خواص اور عوام کا تفرقہ ہے۔ ایسا ہی ابتدائے دنیا میں سب لوگ تو یکساں حالت میں نہیں رہے ہوں گے۔ جسمانی قوت یا اعوان و انصار کی کثرت یا کمی دوسری وجہ سے بعض لوگ ضرور اکابر قوم سمجھے جاتے ہوں گے اور قاعدیہ ہے کہ جس کو انسان اپنے سے بہتر اور برتر سمجھتا ہے۔ اس کی بھی باتیں اس کو بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ یوں سب سے پہلے حسن کا خیال پیدا ہوا ہو تو عجب نہیں اور پھر تو مثل دوسرے خیالات کے یہ خیال بھی ابابن جدمتوارث ہوتا چلا آیا۔ اور یہی سبب ہے کہ ملکوں میں مذاق حسن کے مختلف ہونے کا کہ ہر ملک میں جو شخص سب سے بہتر اور برتر لوگوں نے اس ہی کو نمونہ حسن قرار دے لیا۔ تم نے نیپولین شاہ فرانس کی تصویر تو دیکھی ہو گی۔ اس کی ڈاڑھی تھی چگی اور ڈاڑھی کی خوبصورتی ہے بھری ہوئی گول مگر نیپولین کی دیکھا دیکھی سارے فرانس نے اپنی ڈاڑھیاں چگی کر لیں اور اسی کو شعار خوبصورتی ٹھہرا لیا اور چگی ڈاڑھی کا نام رکھا امپیریل بیرڈ یعنی شاہانہ ڈاڑھی۔ ہم لوگوں میں جو انگریزی وضع کھانے میں پینے میں لباس میں نشت و برخاست میں طرز تمدن میں ہر چیز میں وبا کی طرح پھیلتی جا رہی ہے۔ اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ انگریز ہیں وقت کے حاکم اور ان کی تمام ادائیں خوشنما لگتی ہیں اور ہم لوگوں کے مذاق ہیں کہ یوٹائیو ما انگریزی طور کے ہوتے چلے جاتے ہیں بغیر خلقت تو اختیار بات نہیں مگر رفتہ رفتہ مہندی اور ولیمہ کے عوض ہمارے یہاں کے بڈھے انڈے کی زردی کا خضاب تو ضرور کرنے لگیں گے۔ حسن کی نسبت شخصی مذاقوں کی تاویل چنداں مشکل نہیں۔ ایک شخص میں تمام محاسن صورت کا جمع ہونا تو کیا ہے۔ اکثر یوں ہی ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑے حسینوں میں بھی دو چار نقص ضرور ہوتے ہیں۔ اب یہ پسند کرنے والے کی تجویز پر منحصر رہا کہ چاہے جس پہلو کو ترجیح دے۔ بعض رنگ پر مرتے ہیں اور بعض نقشے کی نزاکت پر نظر کرتے ہیں، بعض حسن داد کے خریدار ہیں اور بعض دام زلف کے گرفتار۔

بتا: حسن اگر خصائص انسانی سے ہوتا تو جو ماخذ آپ نے بیان کیا بلاشبہ قابل تسلیم تھا، مگر جمادات، نباتات، حیوانات غرض تمام موجودات میں کوئی چیز حسن سے خالی نہیں، والد مرحوم زندہ تھے کہ ایک مقدمے کی پیروی کے لیے انہوں نے ناظر بھائی کو گرمیوں کے دنوں میں نین تال بھیجا۔ اور مجھ کو ان کے ساتھ کیا تو پہاڑ دھندلا دھندلا کئی منزل سے نظر آتا تھا۔ مگر تین چار کوس کے فاصلے سے تو ہم اس کو اچھی خاصی طرح سمو چا دیکھنے لگے۔ و صبح کا وقت اور پہاڑ کی چوٹیوں پر سفید براق برف گویا سنگھار میز بڑا قد آدم آمینہ لگے کہ آفتاب سوتا اٹھ کے پہلے شبنم سے منہ دھوئے اور پھر اپنا چہرہ اس آئینے میں دیکھے اور چوٹیوں کے گرد اگر د جب شفق کی سرخی اور دامن کود کی سبزی پر آنکھ پڑتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک نازنین گلابی دوپٹہ اوڑھے اور ہری پشواڑ پہنے غور سے کھڑی ہوئی اس پاس کی چیزوں کی سیر دیکھ رہی ہے۔ شروع میں تھوڑی دیر تک تو اس کا شعور تھا کہ واقع میں پہاڑ ہے اور ہماری قوت متخیلہ نے اس کو نازنین اور شفق و سبزے کو اس کا لباس بنالیا ہے۔ مگر آفتاب کی کرن نکلتے ہی اوپر برف کے کنارے اور نیچے ندی نالے سارے جگمگا اٹھے جیسے سین مین سچا گوٹا۔ اب تو جو خیال تھا وہ حقیقت الحال ہو گیا۔ قوت نامیہ کا ہر طرف یہ زور شور کہ ایک چپہ بھر جگہ سبزہ خود رو سے خالی نہیں۔ شاعر تو سبزے کو خوابیدہ باندھتے ہیں مگر وہاں کا سبزہ بیدار۔ ہوا کے جموں کوں سے ہر وقت متموج ہوا تصنع اس وقت تو یہی خیال میں آتا تھا کہ ہوا کے گدگدانے سے پہاڑ کے پیٹ میں ہنسی کے مارے بل پڑ پڑ جاتے ہیں۔ دونوں ہاتھوں سے پگڑی سنبھال کر درختوں کو دیکھتو ایسا شبہ ہو کہ آسمان کی چھت بہت پرانی ہو چکی تھی۔ شاید اس کی دراڑیں ہیں۔ رنگ رنگ کے جانور پھدک پھدک کر ادھر سے ادھر اس طرح اڑتے پھرتے تھے کہ گویا جگہ جگہ چوتھیاں کھیلی جا رہی ہیں غرض ہر چیز پر ایک قدرتی جوہن تھا کہ جی بے اختیار اونا چلا جاتا تھا۔ ایسے کسی موقع پر آپ کے جانے کا اتفاق ہوا تو آپ کو معلوم ہو کہ حسن ایک کیفیت خدا داد ہے۔ ہر جگہ ہے اور ہر چیز میں ہے۔ اسی نین تال کے راستے میں ایک ندی ملی تھی۔ دنیا کی تمام صنعتیں تمام دست کاریاں جس غرض سے ہیں صرف اتنی ہی بات کے لیے کہ چیزوں میں حسن پیدا ہو۔ کسی انگریزی شاپ (دکان) میں میرے ساتھ چلے۔ تو میں آپ کو دکھا دوں کہ صرف مکان کی آراستگی کے لیے کیسا کیسا اسباب انگریزوں کی ولایت سے بن کر چلا آ رہا ہے۔ زندگی کے تمام ساز و سامان میں کون سی چیز ہے جس میں خوبی نہیں اور یوں آدمی آنکھوں پر ٹھیکری دھر لے اور ہدایت کا انکار کرے تو اس کا اعانہ نہیں۔ حسن کا تقاضا طبعیت ماننا آسان ہے یا ایک عالم کو مجنوں اور بتا! خبط۔

عارف: بات کو بہت طول ہوتا جاتا ہے اور حجت اور تقریر سے لکھی کسی بات کا تصفیہ ہوا نہیں اور مدت العمر کے جھے ہوئے خیال کا دفعتاً دل سے نکالنا بھی مشکل۔ میں تم کو اتنی نصیحت کرتا ہوں کہ جو کچھ میں نے کہا ہے اس کو مختلف اوقات



میں تم خود سوچو اور میں نے بھی یہی کہا تھا کہ مدتوں خود غور کرتا رہا۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ آخر کار تم میری رائے کے ساتھ اتفاق کرو گے یا نہ کرو گے مگر اس کا تو مجھ کو پورا یقین ہے کہ انشاء اللہ تمہاری یہ شورش تو ضرور فرو ہو جائے گی جس طرح تم دوسری چیزوں کا استحسان کرتے ہو۔ یعنی مثلاً نینی تال کی سیر سے تمہاری طبیعت کو ایک طرح کی تفریح ہوئی اگر اسی طرح کی تفریح تم کو خوبصورت آدمی کے دیکھنے سے ہو تو اس میں میرے نزدیک کوئی اعتراض کی بات نہیں بلکہ اس استحسان کو تم تقاضائے طبیعت بھی سمجھو تو چنداں مضائقہ نہیں مگر دل میں انصاف کرو کہ اس استحسان کو اس استحسان کے ساتھ کیا مناسبت اور فرض کرو کہ استحسان مردم یعنی حسن پرستی جیسا تم کہتے ہو۔ تقاضائے طبیعت انسانی ہی ہے تو طبیعت انسان کے اور بہت سے تقاضے ہیں مگر چاروں چاروں کو روکنا اور ضبط کرنا پڑتا ہے۔ سب میں زیادہ شدید تقاضا غذا کا ہے۔ تاہم بعض اوقات طبیب حکم دیتا ہے کہ فائدہ کرو اور فائدہ کرتے ہیں۔ یا غریب آدمی کو ایک وقت کھانا میسر نہیں آتا اور وہ انٹریوں کو موسوس کر کے رہ جاتا ہے۔ اسی طرح تقاضائے حسن پرستی مطلق العنان تو رہ نہیں سکتا۔ حسن کیاب اور اس کے خواہاں بہت معشوقوں کے غزوہ واداسے شہید ہونے کا انتظار بھی نہ کریں۔ آپس ہی میں رقابت کی وجہ سے لڑمیں اور مشکل یہ ہے کہ کمیابی ٹھہری شرط حسن۔ کیونکہ اگر حسن کثرت سے ہوں تو بے قدر ہو جائے۔ کوئی اس کی طرف رغبت بھی نہ کرے۔ پس حسن پرستی فی نفسہ ایسی خواہش ہے کہ ہزار خواہشوں میں ایک کی کامیابی کی بھی توقع نہیں۔ تو کیوں آدمی ایسی حالت اپنے پیچھے لگائے کہ اس سے سوائے رنج کے اور کچھ ہاتھ نہ آئے۔ موقع پر آئی ہوئی بات کہنی پڑتی ہے تم کو معلوم ہے کہ واقع اور ادعائی ضرورتوں کی شناخت کیا ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ جو چیز جس قدر زیادہ سہولت سے میسر آ سکتی ہے۔ بس جان لو کہ ہم کو اسی قدر زیادہ اس کی حاجت ہے۔ مثلاً ہوا اور پانی اور غلہ سب ضرورت ہی کی چیزیں ہیں غلے سے زیادہ پانی اور پانی سے زیادہ ہوا مگر ہوا سب سے زیادہ سہل الحصول ہے۔ پانی اس سے کم اور غلہ اس سے بھی کم۔ اسی طرح لوہا اور چاندی اور سونا اور موتی اور جواہرات۔ سب سے زیادہ بکار آمد لوہا ہے اور اسی کی زیادہ افراط ہے۔ پس حسن اگر حقیقت میں ہم کو درکار ہوتا تو ضرورت تھا کہ اس کی افراط بھی ہوتی اور افراط ہوئی تو پھر حسن کہاں۔ حسن تو اسی وقت تک حسن ہے کہ اس کے دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہوں۔

بتلا: آپ کا یہ فرمانا بالکل ٹھیک ہے کہ حسن کیاب ہے اور جو ہے اس پر دسترس کا ہونا مشکل۔ اور میں اسی سوچ میں بیٹھا تھا کہ آپ تشریف لائے۔ مگر دنیا کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں بھی مشکلیں پیش آتی ہیں اور یہ تو وہ لذتیں ہیں کہ دنیا کے سارے مزے اس کے آگے بیچ ہیں۔ بلکہ میں تو ایسا سمجھتا ہوں کہ جب تک لذت حسن کا شمول نہ ہو دنیا کی کسی چیز میں کوئی مزہ ہی نہیں تو ایسے عمدہ مطلب کے حصول میں اگر جان تک بھی جو کھوں میں ہو تو کیا مضائقہ۔ اتنا خدا کا شکر ہے کہ

دوسروں کو محال ہے اور مجھ کو آسان۔

عارف: کیوں تم میں خصوصیت کیا ہے۔ کیا تم کہیں کے حاکم ہو۔ یا تمہارے یہاں کچھ دولت پھٹ رہی ہے۔

بتانا: بس آپ کے نزدیک تو دنیا میں حکومت اور دولت دو ہی چیزیں ہیں۔ اجمی حضرت میں حسن کو دولت رکھتا ہوں۔ اب چند روز ہوئے چچا باوا کے لحاظ سے میں نے آنا جانا چھوڑ دیا۔ ورنہ شہر میں ایسا کون تازمین ہے جو مجھ کو پیار نہیں کرتا۔ ذرا میرا رخ دیکھیں تو گلے کی ہاریو جائیں مجھ کو حسن کی کیا کمی ہے۔ آج چاہوں تو ایک ریوڑ پال لوں۔

عارف: لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلیٰ العظیم ۛ میں تو سمجھتا تھا کہ تم کچھ عقل رکھتے ہو۔ اب معلوم ہوا کہ عقل اور حیات اور غیرت اور عزت اور آبرو اور مذہب کسی چیز سے تم کو بہرہ نہیں اور تمہاری حالت بڑی خطرناک حالت ہے۔ تم تو جناب میر تقی صاحب کے پاس برسوں رہو تب کہیں جا کر آدمی بنو تو بنو۔ تمہاری عقل کا تو یہ حال ہے کہ ابھی تک خوبصورتی کا خطبہ تمہارے سر سے نہیں نکلا۔ تم بات بات میں اس طرح منہ بھر بھر کر اپنے تئیں حسین اور خوبصورت کہتے ہو کہ گویا حسن صورت بڑا جوہر ہے۔ مرد ہو کر تمہیں عورتوں کے ہنر پر ناز کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ خوبصورتی کے خیال سے کچھ تم ہی اپنے دل میں خوش ہوتے ہو گے۔ مگر غیرت مندوں کی نظر میں اس گورے چڑے نے سارے خاندان کی عزت ڈبو دی اور تم کو دنیا اور دین دونوں کے کام سے کھو دیا۔ اور خیر جوان ہوئے پیچھے وہ کم بخت خوبصورتی گئی گزری ہوئی تھی تو بچپن کے اس خیال کو جانے دیا ہوتا۔ نہیں وہ خطبہ کہ بدستور تازہ ہے۔ منہ پر ڈاڑھی نکل آئی ہے۔ چہرہ پکا کیمنخت ہو گیا۔ وہ رنگ و روغن و وزنی و زراکت کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ مگر خدا جانے وہ تمہاری خوبصورتی کس چیز سے عبارت ہے۔ کہ اس میں فرق نہ آیا۔ شہر کے تازنیوں کا حال تو معلوم نہیں مگر مرد سے میں جو تمہارے چاہنے والے تھے وہ تمہارے رہتے ہی ایک ایک کر کے تم سے بے رخی کرنے لگے تھے۔ اور کیا تم کو اس کا امتیاز نہ ہوا ہو گا اور جب تمہاری وہ لڑکپن کی کیفیت بدل گئی کہ خیر وہ ایک طرح خوبصورتی تھی بھی تب بھی مرد خدا تم کو تنبیہ نہ ہوئی کہ کیا ایسی بے ثبات اور ناپائیدار چیز کے درپے ہونا جو آج ہے اور کل نہیں۔ یہ کیفیت جو تم میں اب ہے۔ اگرچہ اس کو خوبصورتی سمجھنا تمہارا ہی ادعا ہے مگر بری یا بھلی جیسی ہے اسے تو قیام ہو۔ جس نے تم کو بچپن میں دیکھا ہے۔ اب سے چار برس بعد پہچاننے کا بھی تو نہیں کہ یہ وہی بتانا ہے یا دوسرا شخص ہے۔ میرے نزدیک تو خوبصورتی کا دعویٰ اب بھی تم کو زیب نہیں دیتا مگر ایک وقت آنے والا ہے تو اس کو آیا ہوا سمجھو جب کہ تم خود پکارا ٹھو گے۔

دریغا	کہ	عبد	جوانی	برفت
جوانی	مگو	زندگانی		برفت

ذرا خیالات کو اونچا کرو۔ نظر کو تھوڑا آگے بڑھاؤ۔ یہ خوانشیں جن کا تم اس قدر اہتمام کر رہے ہو، خدا نے گدھے کہتے بندر، سور، ذلیل سے ذلیل جانوروں کو بھی دی ہیں۔ بلکہ جانوروں میں یہ قوتیں آدمی سے بہت زیادہ ہیں۔ کیا آدمی کے لیے شرم کی بات نہیں کہ جانوروں کی ریس کرنے پر حریص ہو۔ تم کو اس بات پر بڑا اگھمنڈ ہے کہ نازنیاں شہر یعنی بازاری عورتیں تم کو پیار کرتی ہیں۔ یہ جموٹی رکابیاں، یہ چھوڑی ہوئی بڑیاں یہ کھائی ہوئی قلیاں کسی بھلے مانس کی غیرت تقاضا کر سکتی ہے کہ ان کو منہ لگائے یا پاس بٹھائے نرمی خوبصورتی کو اگر ہو بھی لے کر کیا آگ لگانی ہے۔ جبکہ ان میں شرم و حیا نہیں، مہرو فانی نہیں، عنف و عصمت نہیں، غیرت و حمیت نہیں۔

بتا: میں نے تو ان لوگوں کا تذکرہ آپ سے صرف اس غرض سے کیا تھا کہ میں حسن کی خواہش کروں تو غالباً میرے لیے اس کا بھم پہنچنا کچھ دشوار نہ ہوگا۔ کیونکہ میں ان لوگوں کو اپنی طرف بھی مائل پاتا ہوں۔ مجھے دوسرا ذریعہ تقریب درکار نہیں۔ جس دن چچا بادل شریف آئے میں نے ان لوگوں سے ملنا جلنا قطعاً موقوف کر دیا اور آئندہ بھی میرا ارادہ ان لوگوں سے ملنے جانے کا ہرگز نہیں۔ چچا بادل کے آنے کا تو مجھ کو ایک حیلہ ہاتھ لگ گیا ورنہ میں نے تھوڑے ہی دنوں کے اختلاط میں ان لوگوں کو خوب آزمایا، بک گیا، برباد ہو گیا، چچا بادل نہ ہوتے تو فاقوں پر نوبت پہنچ چکی تھی۔ مگر حقیقت میں عجب بے مروت قوم ہے۔ چندے کے بندے اور دام کے غلام۔ اس میں شک نہیں کہ مجھ کو پیار بھی کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ لے بھی مارتے ہیں۔

عارف: الحمد للہ میرا جی یہ سن کر بہت خوش ہوا کہ تم کو اس نالائق گروہ سے تو نفرت ہوئی۔ اور میں تو بھائی اس کو جناب میر صاحب کا تصرف سمجھتا ہوں۔

بتا: خیر جو کچھ ہو مگر حسن پرستی کی سکک میرے دل میں باقی ہے وہ نہیں نکلتی۔

عارف: اب بہت دیر باتیں ہوئیں۔ آدمی کے دل کا حال ہر وقت یکساں نہیں رہتا۔ انشاء اللہ پھر کسی دن موقع دیکھ کر گفتگو کریں گے۔ اس اثناء میں تم بھی وقتاً فوقتاً سوچنا اور غور کرنا اگر خدا کو منظور ہے۔ تو خود تمہارے ہی دل سے کوئی نہ کوئی بات ایسی پیدا ہوگی کہ اس سے تمہاری تسکین ہو جائے گی۔ اتنی بات تمہارے کان میں اور ڈال دیتا ہوں کہ دنیا کے تمام معاملات کا دار خیالات پر ہے۔ شمرے

برخیالے صلح و شان و جنگ شان  
برخیالے نام شان و ننگ شان

ایک شخص کو دیکھتے ہیں کہ ایک غرض کے پیچھے دیوانہ بن رہا ہے اور اسی جیسے ہزاروں لاکھوں آدمی ہیں کہ اس غرض سے

مطلق سروکار نہیں رکھتے۔ زندگی کے دن پورے کرنے کو کتنی کی چند چیزیں درکار ہیں اور ان کے ہم پہنچانے کے لیے کچھ زیادہ زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ صائب نے کیا خوب کہا ہے۔ شعر۔

حرص قانع نیست صائب ورنہ اسباب جہاں  
آنچه من درکار دارم بیشتر درکار نیست

اور جب دوسرے لوگ ہمارے ہی ابناء جنس ایک چیز کے بدوں خوش و خرم رہ سکتے ہیں تو اس سے بخوبی ثابت ہے کہ حقیقت میں وہ چیز داخل ضروریات زندگی بلکہ داخل تفریحات بھی نہیں ہے۔ ان لوگوں نے ایک طرح پر خیال کیا اور اس چیز پر غالب آئے اور ہم نے دوسری طرح پر سوچا اور غلوب ہو گئے۔ یوں تو سوچنے اور غور کرنے کو ہزاروں باتیں ہیں مگر تمہاری حالت کے واسطے موت کا تصور کرنا بالخاصہ مفید ہے۔ اگر دن رات میں تھوڑی دیر کے لیے بھی آدمی اپنی تئیں مرتا ہو فرض کر لیا کرے اور یہ تو یقینی ہے کہ ایک نہ ایک دن سچ مچ اس کو مرنا ہو گا تو دنیا کی بہت سے ترغیبات سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ اور چونکہ دینداری کے خیالات ابھی تمہاری طبیعت میں راسخ نہیں ہوئے۔ موجبات ترغیبت کے پاس نہ پھٹکنا ورنہ سارا کیا کرایا دم کے دم میں اکارت ہو جائے گا۔

## بتا کا دام محبت میں مبتلا ہونا

عارف تو یہ کہہ کر اس وقت رخصت ہو گیا۔ بتا کے شیا طین برابر اس کی گھات میں لگے ہوئے تھے۔ میر منقی کا جانا سنتے ہی سب نے چاروں طرف سے یورش شروع کی۔ بتا تو ایک مدت سے ادھار پر عیاشی کر ہی رہا تھا۔ سینکڑوں روپے ان لوگوں کے اس پر چڑھے ہوئے تھے۔ پہلے کوہلے ہوئے خدا جانے میر منقی کے رہتے ہوئے بھی انہوں نے کیوں کر صبر کیا ہو گا۔ میر منقی کا اگر جانا نہ ہوتا تو آخر ایک نہ ایک دن اس قرض کا جھگڑا ان کے روبرو پیش ہوتا تو وہ عمدہ طور پر فیصلہ بھی کر دیتے اب اونے پونے کیسے سوائے ڈیوڑھے کی قسط بندی پر تو قرضے کا چکوتا ہوا۔ اور ان لوگوں کے پاس آ کر بیٹھنے بات کرنے سے، بتا کی طبیعت جو میر منقی اور عارف کے سمجھانے سے کسی قدر سنبھل چلی تھی۔ پھر بگڑی۔ سامان تو ایسا بندھا تھا کہ بتا پھر بدستور سابق آوارہ مزاج ہو جائے۔ مگر ادھر تو نصیحت کے خیالات تھے تازہ اور ادھر ادائے قرض کی وجہ سے بتا کو ان لوگوں سے ایک طرح ناخوشی اور تو کسی کے پاؤں نہ جھے مگر اب سے کوئی تین چار برس پہلے کا مذکور ہے۔ بتا کے والد ان دنوں زندہ تھے۔ اسی محلے میں بتا کے گھر سے ذرا فاصلے پر ایک عورت کراہیہ کے مکان میں آ کر رہی۔ وہ تھی تو کائنات کی کوئی خانگی پر اس نے اپنے تئیں بیگم مشہور کیا۔ باوجودیکہ تھوڑے ہی دنوں کی آئی ہوئی تھی مگر سارے محلے میں اس کی خوبصورتی اور لیاقت کا نعل مچ گیا، عیاش مزاجوں میں جو جس ڈھب کا تھا۔ اپنے شوق کی چیز میں بیگم کا مداح تھا۔ شاعر کہتے تھے فی البدیہہ شعر کہتی ہے۔ ستار بجانے والوں میں چہ چا تھا کو بول خوب بجاتی ہے، تاش گنجفہ چوسر شطرنج کھیلنے والے ان تمام کھیلوں میں اس کے کمال کے قائل تھے۔ ضلع جگت بھتی حاضر جوانی پہیلی مکرنی نسبت میں سب مانتے تھے۔ کہ اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اس کی خوبصورتی میں لوگ کچھ کام کرتے تھے مگر اس کے جامہ زیب ہونے پر سب کو اتفاق تھا بتا تو خود ایسی خبروں کی ٹود میں لگا رہتا تھا۔ اس کو بیگم کا حال سب سے پہلے معلوم ہوا ہو گا۔ لیکن باپ کے رہتے محلے میں بدل جاتی نہیں کر سکتا تھا، نہ جاسکا۔ باپ کے پیچھے جب بتا کھل کھیا تو جہاں اس نے نا اقلیاں کیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ بیگم سے ملا۔ شاعری اور ستار اور شطرنج اور کیا یہ تو سب بہانے تھے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ عورت تھی بڑی گویا اس کی زبان کبر دیتی تھی کہ خواصی یا مصاحبہ یا کسی دوسرے طور پر اس نے بادشاہی محلات میں ضروری تربیت پائی ہے یا کیا عجب ہے کہ جیسا وہ کہتی تھی خود بیگم ہی ہو۔ لسانی کے علاوہ اس کا سلیقہ مجلس بھی بہت دلکش تھا وہ نہایت جلد آدمی کے دل کو ٹٹول لیتی اور ہر ایک کے ساتھ اس ہی کے مذاق کی باتیں کرتی۔ یہ عمل تھا جس کے ذریعے سے وہ لوگوں کے دلوں کو مسخر کرتی تھی۔ ورنہ صورت شکل کے اعتبار سے وہ چنداں قدر کی چیز نہ تھی۔ بتا کے ساتھ آنکھیں چار ہوتے ہی وہ پہچان گئی

کہ یہ کوئی نیا مردوا بنا ہے۔ اس نے بتلا کو دور سے کھڑے ہو کر ایسے انداز کے ساتھ سلام کیا جیسے کوئی ہندو آفتاب کو ڈنڈوت کرتا ہے اور گاؤ تکیہ سے وہ لگی ہوئی بیٹھی تھی چھوڑا اپنی جگہ بتلا کو بٹھایا اور آپ مودب سامنے ہو بیٹھی۔ بتلا نے چاہا کہ اس کو اپنے برابر بٹھائے مگر وہ ایاز قدر خود بشناس کہہ کر پہلو پر نہ آئی۔ بتلا تو تمہید کلام ہی سوچتا رہا کہ اتنے میں وہ آپ ہی بولی ایک مدت سے دلی کی تعریفیں سن سن کر جی پھڑکتا تھا اور دل میں ارمان تھا کہ اگر پرہوتے تو اڑ کر جاتی اور ایک نظر دلی کو دیکھ آتی۔ بارے۔ مان نہ گمان خود بخود ایسا اتفاق پیش آیا کہ خدا نے دلی میں لا بٹھایا۔ اور جیسا سنا تھا اس سے ہزار حصے بڑھ کر پایا۔ چشم بدور لکھنؤ میں دولت کی افراط ہے اور لوگ بھی وہاں کے بڑے زندہ دل ہیں۔ حسن کی جو قدر و منزلت ہمارے لکھنؤ میں ہے کسی دوسرے شہر میں کم ہوگی اور یہی سبب ہے کہ ملکوں ملکوں سے حسن کھینچ کر سب لکھنؤ میں سمٹ آیا ہے اور میرا رہنا بھی ایسی ہی جگہ ہوا ہے کہ اس کو حسن کا اکھاڑا کہنا چاہیے۔ مگر اپنا شہر ہے تو ہونے دو بات تو سچی ہی کہی جائے گی۔ ماشاء اللہ آپ کی صورت کا آدمی بھی میری نظر سے نہیں گزرا۔

بتلا: یہ تو سب تمہاری مہربانی ہے۔ چونکہ تم نظر محبت سے دیکھتی ہو۔ تم کو تو میری صورت بھی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ ہم مردوں کی صورت اگر اچھی ہوئی بھی تو کیا بے مصرف صورتیں تو تم لوگوں کی ہیں کہ ایک عالم تمہاری ان صورتوں ہی کے پیچھے دیوانہ ہو رہا ہے۔ میں نے بھی تمہاری صفت و ثنا بہت کچھ سنی تھی۔ اور تمہارے دیکھنے کے لیے دل بے قرار تھا۔ مگر موقع نہیں بن پڑتا تھا۔ اب جو تم کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ حقیقت میں لکھنؤ کی خراش تراش اور وضع داری کو دلی والے نہیں پا سکتے۔ مگر یہ تو کہو کہ گھر تمہارا ٹھہرا لکھنؤ یہاں دلی میں تمہارے قیام کا کیا بھروسہ۔

بیگم: ”ہم لوگوں کا کم بخت اس طرح کا برا پیشہ ہے کہ قرآن کا جامہ پہن لیں تب بھی تو کوئی اعتبار نہیں کرتا۔ آپ کو یقین آئے نہ آئے میں ایک عزت دار خاندان کی بیٹی ہوں خدا جانے یہ بھی کرم میں لکھا تھا کہ ایسے برے احوال سے پردیس میں پڑی ہوں۔ میرا حال اس قطعے کے مصداق ہے۔“

قطعہ:

رہے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو  
ہم خن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو  
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو بیمار دار  
اور اگر مر جائے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

میں جس وقت لکھنؤ سے نکلی دل میں یہ ٹھان کر نکلی کہ اب اس شہر کو پیٹھ دکھائی نہ جیتے جی منہ نہ دکھاؤں گی۔ جس حالت میں آپ مجھ کو دیکھتے ہیں جس قدر مجھے اس سے نفرت ہے۔ بس خدا ہی کو خوب معلوم ہے مگر موت اپنے بس کی نہیں۔ شاد بایز بستن۔ ناشاد بایز بستن۔ آج اگر کوئی بھلا آدمی خدا اس کے دل میں رحم ڈالے اور میری دست گیری کرے تو مجھ کو چرخہ کا تانا منظور، چکی پیسنی قبول میں اس کی کفش برداری کو حاضر ہوں مگر مان نہ مان میں تیرا مہمان زبردستی کسی کے سر ہو جاؤں۔ آپ سے آپ کس کے ساتھ لگ لوں۔

ہر چند بتلا کی آوارگی ان دنوں بڑے زوروں پر تھی مگر اس کے دل میں کسی عورت کے ساتھ تعلق لازمی پیدا کرنے کا خیال کبھی نہیں آیا تھا۔ یہ نیگم کی سحر بیانی تھی کہ ابھی اس کی تقریر پوری نہیں ہونے پائی کہ بتلا نے اس کو گھر میں ڈال لینے کا پہلے پہل کچھ یوں سا ارادہ کر لیا۔ نیگم میں دو باتوں کی کمی تھی کہ ایک تو اس کی صورت کچھ بہت عمدہ نہ تھی بنانے سنوارنے سے وداتی بھی نظروں میں جھپتی تھی۔ دوسرے گانا ناچنا جس کی ان دنوں بتلا کو چاٹ لگی ہوئی تھی اس کو مطلق نہیں آتا تھا۔ تاہم اس نے اپنی لسانی سے بتلا کو پہلی ہی ملاقات میں اتنا تو گرویدہ کر لیا کہ شام کا گلیا ڈیڑھ پہر رات کو توپ اس کے وہیں بیٹھے بیٹھے چل گئی۔ اس اثنا میں نیگم نے خوب مزے مزے کی گلوریاں اپنے ہاتھ سے بنانا کر بتلا کو کھلائیں۔ دو دور چائے اور کافی کے چلے۔ بتلا اگر ایک جلسے میں مدعو نہ ہوتا تو اس سے رات کا روپڑنا بھی کچھ تعجب نہ تھا۔ بارے مکان پر سے آدمی آیا کہ صاحب جلسہ خود آپ کو لینے آتے ہیں۔ ناچار اٹھنا پڑا۔ اور جلسے کی سن کر نیگم کو بھی اصرار کرنے کا موقع نہ تھا۔ مگر چلتے چلتے نیگم نے اتنا عہد تو لے لیا کہ جلسے کے سوائے اپنے یہاں ہو یا کسی دوست کے یہاں بلاناغہ ہر روز ملاقات ہوا کرے گی اور میر متقی کے آنے تک ایسا ہی ہوتا رہا اور اتنے دن میں نیگم نے بتلا کے دل میں بخوبی اپنی جگہ کر لی۔ میر متقی کی الاحول سے جہاں اور شیطان بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں ایک نیگم صاحبہ بھی تھیں۔ میر متقی کے رہتے بھی نیگم نے بہتیرے ڈھب لگائے کہ بتلا زیادہ نہیں تو کبھی کبھار کھڑے کھڑے صورت دکھایا کرے۔ مگر بتلا خود ان دنوں ہتھے سے اکھڑا ہوا تھا آنا جانا تو درکنار زبانی سلام و پیام تک کا بھی روادار نہ ہوا۔ بتلا بے چارے کے حال پر خیال کر کے کس قدر افسوس آتا ہے۔ شعر

قسمت تو دیکھیے کہ کہاں ٹوٹی ہے کند

دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رو گیا

قریب تھا کہ نیگم تو اس کو صبر کر کے بیٹھ رہے، اتنے میں میر متقی کو سنا کہ تشریف لے گئے۔ نیگم تو اس خبر کو سنتے ہی مارے خوشی کے اچھل پڑی اور اسی وقت سے لگی بتلا کے انتظار میں بار بار مڑ مڑ کر دروازے کی طرف دیکھنے۔ ایک دن گزرادو

دن گزرے تین دن گزرے بتانا کا پتہ نہیں۔ سمجھی کہ چچا نے ضرورتاً نتیجے کو کچھ پٹی پڑھائی۔ آخر جب اپنے اہل برادری کو سنا کہ حساب کتاب کو آنے لگے تو اس نے بھی کسی کے ہاتھ ایک رقعہ بھیجا۔ (رقعہ) جامن یا باں شورا شوری دیا بایں بے نمکی اس قدر بے مروتی ایسی بے وفائی۔ کچھ قصور کوئی خطا۔ دل کے ایسے بودے اور ارادے کے اتنے کچھ تھے تو اتنا رابطہ بڑھانا ایسا گہرا اختلاط کرنا کیا ضروری تھا۔ از برائے خدا چند لمحے کے لیے تشریف لاؤ۔ اور اپنی حقیقت مجھ کو سناؤ۔ میں خدا نخواستہ کوئی بلا نہیں کہ چٹ جاؤں گی۔ آپ کوئی بچے نہیں کہ پھسلاؤں۔ اور اگر آپ کو آنا منظور نہیں تو مجھ سے وہاں پہنچنا کچھ دور نہیں۔ شعر

تم جانو غیر سے جو تمہیں رسم و رادہ ہو  
ہم کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

بتانا یہ رقعہ پڑھ کر غوطہ میں تھا کہ عارف اس کے سر پر آکھڑے ہوئے تھے۔ عارف کے چلے جانے کے بعد بتانا نے رقعے کو پھر کئی بار پڑھا۔ وہ اس وقت جانے میں ہچکچاتا تھا۔ مگر پھر اس نے سوچا کہ اگر میں نہ گیا تو بیگم خود چلی آئے گی۔ اس سے تو میرا جانا بہتر ہے۔ غرض دل خوب مضبوط کر بیگم کے گھر گیا مگر افسوس ہے کہ کچھ گھڑی کو گیا کہ بس اسی کے گھر کا ہو رہا۔ بیگم نے جو کئی مہینے کے بعد بتانا کو دیکھا تو نہایت تپاک سے ملی۔ بس اس کا وہ تپاک ایک جادو تھا کہ بتانا کی تو کیا حقیقت تھی۔ اس کے چچا باوا میر تقی صاحب بھی ہوتے تو پھسلتے نہیں تو لڑکھڑاتو ضرور جاتے۔ دیر تک آپس میں گلے شکوے ہوتے رہے۔ آخر میں بتانا نے شروع سے آخر تک میر تقی کا آنا اور امور خانہ داری کی اصلاح اور ان کی نصیحت اور حاضر کی فضیلت اور میر صاحب کا تشریف لے جانا اور عارف سے متعارف کرانا اور عارف کو سمجھانا اور ارباب نشاط کا حساب کتاب ذرا ذرا بیان کیا۔ بیگم نے بہت ہی توجہ سے بتانا کے قصے کو سنا اور کہا کہ اتنے دن برابر جو آپ کا آنا نہ ہوا۔ اس سے مجھے بڑی آزر دگی ہوئی تھی اور میں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ آپ سے اخیر دو دو باتیں کر کے ضرور اس محلے سے اٹھ جاؤں گی۔ مگر اب جو آپ سے ساری حقیقت معلوم ہوئی۔ میراجی بہت خوش ہوا اور اگر میں جانتی ہوتی تو ضرور میر صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرتی۔ سبحان اللہ! اچھوں کی اچھی ہی باتیں ہوتی ہیں۔ انہوں نے باپ سے بڑھ کر آپ کے ساتھ سلوک کیا، ان کے فرمانے پر چلو تو دنیا اور دین دونوں میں سرخرو۔ میں تو خود آپ سے کہنے والی تھی کہ ان بیسواؤں سے ملنا اور یوں پیسے کو برباد کرنا اور یہ ہر جائی پن اچھا نہیں۔

بتانا: مشکل یہ آ پڑی ہے کہ بی بی کی طرف تو مجھ کو رغبت نہیں پھر آپ کسی طرح زندگی بسر بھی کروں یا نہ کروں۔“  
بیگم: ”بیا بتانی بی سے اگر مرضی نہ ملتی ہو تو ایک اپنی مرضی کی بی بی کرو۔“ ”خدا نخواستہ تم کچھ غریب نہیں ہو کہ دو بیبیوں کا



خرف نہ چا! سکو گے۔ مردوں پر تو خدا نے ایک ایک کو چار چار کا حکم ہے۔

بتا: تم مجھ سے نکاح پڑھنے پر راضی ہو۔

بیگم: ”میں تو خود تم سے کہہ چکی ہوں کہ میں اس حالت میں رہنا پسند نہیں کرتی۔ میں تو کوئی دن جاتا ہے کہ کسی نہ کسی کا دامن پکڑ کر بیٹھ رہوں گی۔ اور اگر تم میری دست گیری کرو تو زبہ قسمت مگر تم کو بہتری مجھ سے بہتر ملیں گی۔ نکاح کرو تو ایسی کے ساتھ کہ پھر بی بی کی تمنا باقی نہ رہے بلکہ مناسب تو یہ ہے کہ نکاح مت پڑھاؤ چند عے کسی کو آ زماؤ۔

بتا: میں تو فکر کرتے کرتے تھک گیا اور سوچتے سوچتے میرا سر دکھنے لگا۔ چچا باوا اور میاں عارف کی تو مرضی یہ ہے کہ میں ساری عمر رنج و غم میں گھل گھل کر مر جاؤں

بیگم: ”نوف دور پار نصیب دشمنان رنج کرے تمہاری بلا اور غم اٹھائے تمہاری پاپوش دنیا میں بار بار جہنم لینا نہیں اور جوانی کی عمر بھی چلتی دھوپ ہے۔ جب اپنا ہی جی خوش نہ رہا تو دنیا کو لے کر کیا چولہے میں ڈالنا ہے۔

بتا: ”دل پر تو قابو نہیں چلتا۔ اس بی بی سے ممکن نہیں کہ مجھ کو انس ہو چارو نا چار دوسری بی بی تو کرنی ہی پڑے گی۔ اچھا تو آج کے آٹھویں دن۔“

بیگم: ”بلکہ پندرہویں دن مگر ایک شرط ہے کہ ہست و نیست جو کچھ کہنا ہو تم خود آ کر مجھ سے کہنا ایسا نہ ہو کہ پہلے کی طرح بیٹھ رہو۔

بتا: ”نہیں کچھ ہی کیوں نہ ہو میں خود ضرور آؤں گا۔ بلکہ سو کا تو بیچ میں ایک دو پیہرے کروں گا“

بیگم: ”قسم کھاؤ“

بتا: تمہاری جان کی قسم۔

بیگم: میری جان تو تم ہو۔

بتا: ”اپنے سر کی قسم۔

یہ عہد و بیان ہو کر بیگم سے رخصت ہوا مگر سچ پوچھو تو آج ہی کا جلسہ جلسہ نکاح تھا۔ آج کی ملاقات میں اس کو پورا یقین ہو گیا کہ بتا پر اس کا جادو چل چکا ہے اور اسی بھروسے پر اس نے آپ مہلت دی ورنہ وہ ایسا ڈھونگ ڈالتی ہے نکاح پڑھائے بتا جانے کا نام نہ لیتا۔ بیگم کے پاس یہ آج کا جانا بتا کے حق میں غضب ہو گیا۔ اس کو میر منقی نے ایک حالت پر پایا اور انہوں نے اور عارف نے اس کو ٹھیل ٹھیل کر کے کچھ دوسر کا یا آج وہ پھر اپنی جگہ پر عود کر آیا۔

## بتالا اور عارف کا مباحثہ

عارف نے اس خیال سے کہ اس کو اچھی طرح بطور خود غور کر لینے دو ایک ہفتے تک اس کی خبر نہ لی۔ پھر جو ملاقات ہوئی تھی تو بتالا کا تیور ہی بدلا ہوا تھا۔ پوچھا کیوں صاحب تم نے کچھ سوچا غور کیا؟

بتالا: ”جی ہاں دوسرے نکاح کی ٹھہرائی ہے“

عارف: (چونک کر) ”ایں دوسرا نکاح سچ کہو۔“

بتالا: ”کیا کروں میں بھی آدمی ہوں۔ میرے سینے میں بھی دل اور دل میں خواہش ہے۔ مجھ کو بھی موافق سے راحت اور ناموافق سے ایذا پہنچتی ہے۔ میری زندگی کا زمانہ بھی محدود ہے اور جوانی کا تو محدود نہیں بلکہ مختصر میں بھی اتنی بات سوچتا ہوں کہ دنیا سے ایک بار جا کر پھر آنا نہیں۔ ان باتوں پر نظر کر کے میں نے یہی فیصلہ کیا ہے کہ آخر مجھ کو تو آسائش ملے۔“

عارف: ”پیشہ آسائش جائزہ کو کون منع کر سکتا ہے اور تم پر کیا موقوف ہے۔ تمام آدمی کوشش کرتے ہیں اور سب کی کوششوں کا دینی ہو یا دنیاوی حاصل ہے آسائش۔ مگر غور طلب بات یہ ہے کہ جس کو تم نے آسائش سمجھا ہے وہ حقیقت میں بھی آسائش ہے یا نہیں۔“

بتالا: ”یہ تجویز کرنا میرا کام ہے۔“

عارف: بس یہ غلط ہے۔ ہم سب ہیں بیمار اور شاربہ ہمارا طبیب۔ اگر بیمار کو اختیار دیا جائے کہ اپنی آسائش کے لیے آپ تجویز کرے تو بیمار یقیناً اپنے تئیں ہلاک کرے گا۔

بتالا: ”آپ اطمینان رکھئے میں نے شرع ہی کے مطابق اپنی آسائش تجویز کی ہے۔ کیا میں نے تمہیں کہا نہیں کہ دوسرے نکاح کی ٹھہرائی ہے۔ اگر بے نکاح کسی عورت کو گھر میں ڈال لینے یا پانچویں نکاح پڑھانے کا نام لیتا تب ہی آپ نے کان کھڑے کئے ہوتے۔“

عارف: ”جواز تعدد نکاح کی نسبت تم نے جس طرح پر اپنا اطمینان کر لیا ہو۔ ذرا مجھ کو بھی تو سناؤ۔“

بتالا: ”میں تو آپ کے ادنیٰ شاگردوں کی برابری بھی نہیں کر سکتا۔ میرا کیا مقدور ہے کہ آپ کو سمجھاؤں مگر تعدد نکاح کی سند تو قرآن کی وہی ایک مشہور آیت ہے“ ”وان خفتم الا نفس طوا فی الیتمی فانکحوا ما طاب لکم من النساء منی وثلث وربع۔“

عارف: ”لیکن اسی کے آگے فرماتے ہیں۔ فان خفتم الا تعلقوا فرحتہ۔ یعنی اگر تم کو یہ خوف ہو کہ متعدد بیبیوں

میں برابری نہ کر سکو گے تو ایک ہی بی بی کرو۔

اسی سورۃ اور اسی پارے میں اور آگے چل کر ”ولن تستطیعوا ان تعللوا بین النساء ولو احرمتم فلا تمیلوا کل المیل فتسد وھا کالمعلقتہ“ یعنی تم بہتر اچا ہو مگر تم سے یہ ہو ہی نہ سکے گا کہ عورتوں میں برابری کر سکو۔ پس سارے کے سارے بھی ایک طرف اب ان دونوں باتوں کو ملاؤ کہ برابر نہ کر سکو تو ایک کرو۔ اور تمہارے کئے برابر ہو نہ سکے گی۔ ایک شخص نے حال ہی میں حرمت تعدد و نکاح پر ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کے نزدیک ان دونوں آیتوں کو ملانے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بس ایک بی بی کرو۔“

بتا: ”ایسی ہی ایسی تفسیریں کر کے تو لوگوں نے دین کو رخنہ ڈالے ہیں۔ پیغمبر ﷺ صاحب اور ان کے صحابہؓ اور تابعین اور تمام بزرگان دین سب متعدد بیبیاں کرتے چلے آئے ہیں۔ ان کو بھی یہ دونوں آیتیں معلوم تھیں اور قرآن کو سب سے بہتر سمجھتے تھے اور ان کا دین بھی بہت زیادہ تھا۔ مگر کسی نے تعدد و نکاح کی ممانعت کا نتیجہ نہ نکالا اور ”ولن تستطیعوا ان تعللوا بین النساء ولو احرمتم فلا تمیلوا کل المیل فتسد وھا کالمعلقتہ“ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس برابری کی نسبت ارشاد ہے کہ تم سے ہو ہی نہیں سکے گی۔ وہ پوری پوری برابری ہے۔ یعنی عدل حقیقی۔ کیونکہ مطلق عدل سے قاعدے کے مطابق فرد کو کامل مراد لینی ہوگی۔ اور وہ نہیں ہے۔ مگر عدل حقیقی اور اسی لیے فرمایا ہے کہ تم سے عدل حقیقی تو ہو نہیں سکے گا تو ایسا بھی تو غضب مت کرو کہ ایک ہی طرف کے ہو رہو اور دوسری کو لٹکا رکھو کہ وہ بیچاری بیچ میں پڑی جموا کرے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عدل حقیقی کے علاوہ کہ وہ داخل درجے کا عدل ہے اور انسان سے اس کا ہونا ممکن نہیں۔ ایک ادنیٰ درجے کا عدل مجازی بھی ہے کہ انسان صرف ایک ہی کا نہ ہو رہے بلکہ دوسری کی بھی خبر گیری کرتا رہے۔ چچا باوا کے رہتے میرے دل میں اس بات کا کھٹکا تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ ضرور مجھ کو ٹوکس گے تو میں نے مولوی محمد فقیر سے اس مسئلے کی خوب تحقیق کی تھی۔ میری سمجھ میں تو یوں آتا ہے کہ پہلی آیت ”وان خفتم الاتعللو فواحته“ میں عدل سے مجازی مراد ہے کہ اگر تم کو اس بات کا ڈر ہے کہ تم ادنیٰ درجے کا عدل بھی نہ کر سکو گے اور بالکل ایک ہی کے ہو رہو گے تو ایسی صورت میں تم کو ایک ہی بی بی کرنی چاہیے اور اگر تعدد و نکاح میں عدل حقیقی مشروط ہو تو فی الواقع جیسا آپ کہتے ہیں ممانعت ہوئی تعلیق بالحال اور اگرچہ اس آیت میں بھی مطلق عدل ہے اور چاہیے کہ یہاں بھی عدل حقیقی مراد ہو۔ مگر دوسری آیت ”ما بعد ولن تستطیعوا... الخ...“ قرینہ صاف موجود ہے اور اگر خدا کو تعدد و نکاح کی ممانعت منظور ہو تو تعلیق بالحال کا پیرایہ اختیار کرنا کیا ضروری تھا۔ صاف صاف کہہ دینا تھا کہ بس ایک بی بی کرو نہ کہ یہ اگر عدل حقیقی نہ کر سکو تو ایک کرو کیونکہ یہ تو ایک ہی تھا کہ عدل حقیقی مقدور بشر نہیں اگر ”وان خفتم الاتعللو“ سے ممانعت تعدد و نکاح مراد

ہو تو معاذ اللہ اس آیت کی ایسی مثال ہوگی کہ پوچھیں تاک کہاں بنے اور جواب میں بانیں کان سے شروع کر کے گدی کی طرف سے دانتی جانب ہاتھ لاکر بتایا جائے کہ یہ بنے۔“

عارف: ”اس میں شک نہیں کہ مولوی محمد فقیر نے اس مسئلے کی اچھی تحقیقات کی اور تم نے جو کچھ سمجھا میرے نزدیک نہایت درست سمجھا۔ مگر پیغمبر ﷺ صاحب سے جو تم نے استشہاد کیا اس کو میں نہیں مانتا۔ یہ دونوں آیتیں عام مسلمانوں کے واسطے ہیں۔ پیغمبر ﷺ صاحب کے نکاح ان میں داخل نہیں۔ پیغمبر ﷺ صاحب کے لیے سورہ احزاب میں ایک پورا رکوع موجود ہے۔“

یا ایہا النبیؐ انا احللنا لک ازواجک اکلاہی اتیت اجورہن... الخ۔

پیغمبر ﷺ صاحب کے لیے چار بیویوں کی قید نہ تھی اور اگرچہ آنحضرت ﷺ ازواج طاہرات میں اپنی طرف سے عدل فرماتے تھے مگر خدا نے ان پر اس کو بھی لازم نہیں کیا تھا۔ چنانچہ اس رکوع میں یہ آیت ہے ”ترجی من تشا منہن وتودی الیک من تشاء ومن البغیت ممن عزلت فلا جناح علیک“ یعنی اپنی بیویوں میں جس کو چاہو اپنے سے جدا رکھو اور جس کو چاہو بٹھا کر پھر بلاؤ تو تم کو کچھ گناہ نہیں۔ اسی طرح پیغمبر ﷺ صاحب کو بلا مہر بھی نکاح کر لینا جائز تھا۔ اور یہ باتیں خصائص نبوی ﷺ میں سے ہیں اور کیا مصلحتیں پیغمبر ﷺ صاحب کے ان ذاتی معاملات میں مضرت تھیں اس کی تفصیل ہے جس کے بیان کرنے کو بڑی فراست چاہیے۔ اسی طرح صحابہ وغیرہ سے استشہاد کرنے میں درست نہیں سمجھتا۔“

بتا: ”مذہباً“ یا عتلاً؟

عارف: ”یہ تو تم نے عجیب غیبات پوچھی۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مذہب مخالف عقل باطل عقل مخالف مذہب گمراہ۔“

بتا: ”جس چیز کے جواز کے لیے نص قرآنی موجود ہے۔ اس سے آپ کو مخالفت کرنے کا سبب۔“

عارف: ”بات یہ ہے کہ شارع نے مردوں اور عورتوں کی معاشرت کے قاعدے ٹھہرا دیئے ہیں۔ نکاح اور مہر اور نفقہ اور طلاق اور خلع اور لعان اور اظہار اور رجعت اور رضاع وغیرہ جتنے معاملات ہیں سب کے واسطے احکام ہیں۔ اگر ان احکام کی پوری پوری تعمیل ہو تو کسی قوم اور کسی مذہب کے زن و شوہر میں اس سے بہتر معاشرت ہو نہیں سکتی۔ مگر خرابی کیا آ کر پڑی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے رسم اور مذہب دو چیزوں کو ملا کر اپنے طرز معاشرت کو آدھا تیرا اور آدھا ٹیر بنا لیا ہے۔ مثلاً پردہ چلو بلاشبہ اسلام کا حکم ہے کہ بیویاں پردہ کریں اور اس میں شک نہیں کہ ایک پردے سے ہزار بار

مفسدوں کا انسداد ہوتا ہے۔ مگر جس سختی کے ساتھ ہم لوگوں نے پردے کو لازم کر لیا ہے۔ افراط ہے، حد شرع سے متجاوز پردہ نہیں ہے۔ مگر قید اور قید جس قدر سخت اسی قدر راید اور نکاح ایک ایسا معاہدہ کہ مرد اور عورت دونوں کی زندگی کی کامیابی اور ناکامیابی راحت اور تکلیف خوشی اور ناخوشی اسی پر موقوف ہے۔ معاہدہ تو ایسا متمم بالشان اور معاہدہ کرنے والے جن کو اس کا نباد کرنا ہے اور جن پر اس معاہدے کا اثر مرتب ہوگا۔ اس سے بے تعلق کیونکہ اکثر تو معاہدہ نکاح ایسی چھوٹی عمروں میں ہو جاتا ہے کہ فریقین میں سے کسی کو بھی اس کے نتائج کے سمجھنے کی اہلیت نہیں ہوتی اور اگر شاذ و نادر ہوتی بھی ہے تو اظہار رائے کر کے بے شرم اور بے حیا اور بے غیرت اور منہ بولا کون کہلائے۔ پس معاہدہ نکاح تو کرتے ہیں۔ مثلاً زید اور ہندہ ایجاب اور قبول کرتے ہیں اور ان کے ولی۔ کھلم کھلا پوری آزادی تو نکاح کے معاملہ میں مرد و عورت کسی کو بھی نہیں۔ رد گئے دے دے دبائے اشارے کنائے وہ بھی مردوں کے لیے بدنمائی ہے اور عورتوں کے لیے نصیحت اور رسوائی سب سے بڑا ظلم جو ہم نے اپنی عورتوں پر کر رکھا ہے یہ ہے کہ بیوہ کو دوسرا نکاح نہیں کرنے دیتے، ہزار باللہ کی بندیاں ہیں کہ انہوں نے شوہر کا منہ تک نہیں دیکھا اور نصیبوں پر ایسے پتھر پڑے کہ رائڈ ہو گئیں۔ ہندوؤں کی طرح سنی ہو کر ایک بار کا جل کر ماری عمر کے جا پے سے ہزار درجے بہتر تھا مگر حرام موت سنی کیوں کر ہوں۔ دنیا میں ناک کٹتی ہے۔ دوسرا نکاح کس طرح کریں۔ غرض جیتی ہیں تو لطف حیات نہیں اور مرتی ہیں تو اپنے اختیار کی بات نہیں تو اس کا مطلب نکلا کہ شارع نے جو حقوق میں سے رتی بھر چھوڑنا نہیں چاہتے تو جو نسبت مرد اور عورت میں شارع کو رکھنی منظور تھی کیونکہ باقی رہ سکتی ہے اور وہ نسبت کیا تھی۔ اس کے لیے میں تمہارے آگے قرآن کی دو آیتیں پڑھتا ہوں۔ سورہ بقرہ میں ہے۔ ”ولہن مثل الذی علیہن بالمعروف وللرجال علیہن درجتہ“ یعنی جیسے عورتوں کی ذمہ داریاں ہیں ویسی ہی راست معاملگی کے ساتھ برتاؤ کرو۔ پس اگر وہ تم کو بھلی نہ لگیں تو عجب نہیں تم کو ایک چیز بھلی نہ لگے اور خدا اس میں بہت سی بہتری کر دے۔ اب فرمائیے کہ تعدد نکاح جائز ہے یا ناجائز۔

ہمتا! میں تو مذہب کا کوئی بڑا محقق نہیں مگر اسی طرح جو رویں اگر زبردستی ہمارے گلے مڑھی جائیں گی تو جو حالت آپ نے بیوہ عورتوں کی بیان کی اس سے بدتر ہماری ہوگی۔ بیوہ عورت کو تو خیر صبر کرنے کے لیے ایک بات بھی ہے کہ شوہر نہیں ہے نہ ہی یہ کیا مصیبت ہے نہ ایک عورت کو آنکھ بھر کر دیکھنے کو جی نہیں چاہتا، بات کرنے کی طرف طبیعت رغبت نہیں کرتی اور آپ کہتے ہیں کہ زبردستی اس کے ساتھ عاشقی کرو۔ اگر خدا کے یہاں ایسی ہی ہیکڑی ہے تو اس کو اختیار ہے دوزخ میں ڈالے جہنم میں جموں نکلے بندگی و بے چارگی۔ مگر میں تو آپ سے صاف صاف کہتا ہوں کہ ایسی مجبورانہ عاشقی مجھ سے نہ ہوئی ہے نہ ہوگی۔

عارف: بلاشبہ تم مغلوب طبیعت ہو رہے ہو اور جب تک تمہاری یہ حالت رہے گی۔ حقیقت میں تم سے خلاف طبیعت کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔

بتانا: اسی میں تو میں آپ سے مدد چاہتا تھا، کہ طبیعت پر غالب آنے کی کوئی تدبیر بتائیے۔

عارف: جو تدبیر مجھ کو معلوم تھی وہی ایک تدبیر ہے میں نے تو اس کے بتانے میں دریغ نہیں کیا۔ پہر بھر تک تمہارے ساتھ اپنا مغز خالی کیا تو لا جواب ہو گئے۔ اور چلتے چلتے تم سے کہتا گیا۔ کہ تم ان باتوں کو فرصت سے سوچنا اور موہبات کے پاس نہ جانا۔ تم یوں سمجھو کہ حسن پرستی مرض ہے سو چنا دو اور موہبات ترغیب سے دور رہنا پرہیز۔ بھائی مرض جسمانی بھی اگر مزمن ہوتا ہے تو اس کو جلد صحت نہیں ہوتی۔ اور بعض صورتوں میں برسوں علالت اور ساری عمر کے لیے پرہیز کرنا پڑتا ہے۔ یہی حال ہے امراض روحانی کا جن کا دوسرا نام ہے بری لت، بد عادت، تمہارا علالت تمہارے ہی ہاتھ میں ہے۔ کرو تو تم اور نہ کرو تو تم۔

بتانا: آپ تو تعدد نکاح میں چند در چند طرح کے خدشات پیدا کرتے ہیں اور بزرگان دین میں کوئی بھی اس سے خالی نہیں۔

عارف: جب ایک بات کی صراحت ہم کتاب اللہ میں پاتے ہیں تو ہم کو کسی بزرگ کے قول و فعل پر نظر کرنے کی ضرورت نہیں، ایک اور دوسرے یہ معاملات ہیں شخصی، جب تک کسی کو طبیعت کی کیفیت حالت ضرورت کا کچھ حال معلوم نہ ہو، ہم بری یا بھلی کوئی رائے ظاہر نہیں کر سکتے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ جو لوگ اپنے لیے اس کی آزادی کو عمل میں لاتے تھے۔ وہ عورتوں کی آزادی میں بھی مضائقہ نہیں کرتے تھے۔ ہماری طرح ان کا معاہدہ نکاح مرنے بھرنے کا معاہدہ نہ تھا۔ ذرا سی ناموافقت ہوئی۔ مرد نے طلاق دے دی یا عورت نے خلع کر لیا۔ تھوڑے تھوڑے مہر ہوتے ہیں۔ ان کو معاہدہ نکاح کا فسخ کر دینا ایک بات تھی نہ طلاق کا سبب نہ دوسرے نکاح کی عارتو ان کی آزادی حق بجانب ہم کیا ان کی ریس کر سکتے ہیں کہ ہماری بیبیاں لوٹ لیں سے بڑھ کر بے اختیار دائم الجھس، ناک چوٹی گرفتار اور پھر تعدد نکاح سے بیبیاں جو بے لطفیاں اور بد مزگیاں خانہ داری میں پیدا ہوتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں تو بزرگان دین کو بھی اس سے نجات نہ تھی۔ امہات المؤمنین یعنی پیغمبر ﷺ صاحب کی ازواج مطہرات میں باوجودیکہ دنیا کے عیش و آرام میں کسی کو میسر نہ تھے۔ تاہم فقر و فاقے میں باہم ویسے ہی محاسدات تھے۔ جیسے سوکنوں میں ہوتے ہیں اور ہونے چاہئیں۔ سنی شیعہ کا تفرقہ جو تم دیکھتے ہو کہ دونوں گروہوں کا خدا ایک رسول ﷺ ایک قرآن ایک اور پھر آپس میں اس درجے کی عداوت اگر سچ پوچھو تو مضرع ہے۔ ان ہی محاسدات پر پیغمبر صاحب کی سب سے پہلی بی بی حضرت خدیجہ الکبریٰ ہیں جن کے کلمن سے حضرت فاطمہ

الزہرہ پیدا ہوئیں۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے پاس ان کے پہلے شوہر کا بڑا سرمایہ تھا۔ جس کو انہوں نے تجارت میں لگا رکھا تھا۔ ان کو ضرورت تھی ایک دیانت دار اور ہوشیار کارندے کی۔ انہوں نے البعثت سے بہت پہلے کا ندکور بنے حضرت محمد ﷺ کی دیانت امانت راست بازی کا حال سن کر ان کو اپنی تجارت کے کام میں لگایا۔ اللہ نے حضرت کی نیک نیتی سے تجارت میں بڑھ کر برکت دی۔ حضرت خدیجہؓ نے حسن کارگزاری سے خوش ہو کر ان کے ساتھ نکاح پڑھ لیا۔ اس نکاح کی وجہ سے جو لوگ نرے دنیا دار تھے البتہ حضرت کی زیادہ وقعت کرنے لگے پھر جب حضرت کا راز بعثت نزدیک آیا۔ تو خوارق عادات پیش آنے لگے۔ کبھی آسمان پر فرشتوں کو دیکھتے، کبھی درخت ان کو سلام کرتے، کبھی غیب سے آواز آتی، ان واقعات کو دیکھ کر ڈرے اور حضرت خدیجہؓ پر اس تمام حقیقت کو ظاہر کیا۔ حضرت خدیجہؓ تیس بڑی باخدا بی بی اور ان کے گھر میں صنف انبیاء اور تو رات کی تلاوت کا بڑا چاہتا تھا۔ انہوں نے سن کر حضرت کو بڑی تسلی دی کہ تم خدا ترس آدمی ہو۔ بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں پر رحم اور رشتہ داروں کے ساتھ سلوک کرتے ہو۔ ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ خدا تم جیسے آدمی کو ضائع کرے اور حضرتؓ کو اپنے بھائی کے پاس لے گئیں جو تو رات کے بڑے عالم تھے۔ پیغمبر آخرا زمان کی پیش گوئیاں تو آسمانی کتابوں میں موجود ہی تھیں اور لوگ دن گن رہے تھے انہوں نے حضرت کو دیکھا اور ان کی حقیقت سنی تو پہچان گئے اور صاف کہہ دیا کہ آپ پیغمبر ہونے والے ہیں۔ جب تک حضرت خدیجہؓ زندہ رہیں پیغمبر صاحب نے دوسرے نکاح کا قصد تک بھی تو نہیں کیا۔ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد پیغمبر صاحب نے متعدد بیبیاں کیں جن میں سے زیادہ عزیز اور سربرآوردہ حضرت ابوبکرؓ کی بیٹی ام المومنین حضرت عائشہؓ تھیں۔ رشتے میں ماں اور عمر میں حضرت فاطمہؓ سے بھی چھوٹی۔ اس سے انکار کرنا اور واقعات کا جھٹلانا ہے کہ حضرت عائشہؓ کا تعزز تمام ازواج طاہرات پر مشتاق تھا اور اسی طرح حضرت فاطمہؓ پر بھی جو اپنے تئیں اپنی والدہ حضرت خدیجہؓ کی جگہ سمجھتی تھیں اور جن کو پیغمبر صاحب کا معاملہ اپنی والدہ کے ساتھ اپنے کانوں کا سنا اور آنکھوں کا دیکھا سب یاد تھا۔ یہ بی بی الاصل سنی اور شیعہ کی بنیاد جنہوں نے یہ سمجھا کہ پیغمبر صاحب کو دنیا میں حضرت فاطمہؓ کے سوا کسی کے ساتھ کچھ انس نہ تھا وہ شیعہ ہو گئے۔ باقسام مہم یعنی تفصیلی اور نصیری اور کیا خوارق ٹوٹ کر بیبیوں کی طرف داری کرنے لگے۔ اہل سنت کہتے ہیں کہ بی بی بی بی کی جگہ اور بی بی کی جگہ یہاں تک درست ہے مگر آگے چل کر انکار کرنے لگتے ہیں کہ خاندان نبوت میں کسی کو کسی سے کسی طرح کا مال نہ تھا۔ بس سنیوں کی بات دل کو نہیں لگتی۔ میں بھی سنی ہوں مگر میرے نزدیک پھوٹ اور نا اتفاقی بے شک تھی تاہم اس سے ان بزرگوں کی مذہبی شان میں کچھ فرق نہیں آتا۔ یہ تقاضائے بشریت ہے اور کیوں کسی کی دین داری میں بشریت سے ہٹا لگنے لگا جب کہ پیغمبر صاحبؐ نے اپنی شان میں فرمایا ہو انما انا بشر مثکم یوحی الی میں بھی تو تم جیسا بشر ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ

مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے۔ غرض اس طول مقام سے یہ ہے کہ جو بے لطفیاں تعدد نکاح کو لازم ہیں۔ خاندان نبوت بھی ان سے محفوظ نہیں رہا دوسرا کس گنتی میں ہے۔

بتنا: اب بھی مجھ کو کون سا لطف حاصل ہے۔

عارف: تم آگ کے جلے ہوئے کو سینکتے ہو۔ یعنی ایک بے لطفی کو دوسری بے لطفی سے دبانا چاہتے ہو مگر ممکن ہے یہ دوسری بے لطفی آخر میں اس پہلی بے لطفی سے زیادہ شاق ہو۔

بتنا: اس وقت جیسا موقع ہو گا دیکھا جائے گا۔ میں ابھی سے فکر مستقبل کر کے اپنے زندگی کو کیوں تلخ کراؤ۔

عارف: تو اب حقیقت میں میری ملاقات لا حاصل ہے۔ مگر میں اتنا کہہ دیتا ہوں کہ تم اپنے حق میں اچھا نہیں کرتے۔ افسوس کہ تم نے مجھ کو جناب میری متقی صاحب سے شرمندہ کیا۔ یہ کہہ کر عارف بہ کمال نارضا مندی اٹھ کر چلا گیا۔



## بتا کا دوسرا نکاح

بتا کے سر پر ان دنوں ایسا جن سوار تھا کہ اس کی عقل ہی ٹھکانے نہ تھی۔ عارف سے پیچھا چھڑا وہ پھر نیگم کے گھٹنے سے جا لگا۔ وہ تو پہلے ہی سے اس کے لیے جال پھیلائے بیٹھی تھی۔ جانا تھا کہ اس پر چھا گئی۔ نیگم بالطبع زیادہ تر اس بات کی طرف راغب تھی کہ بتا آشنائی کے طور پر اس کو گھر میں ڈال لے۔ مگر میر متقی اور عارف کی تعلیم کا بتا پر اتنا اثر ہوا کہ اس نے بے نکاح نیگم کے ساتھ تعلق رکھنے کو پسند نہ کیا۔ پاس تھی مسجد دو طالب علموں کو بلا بھیجا۔ نکاح پڑھا جانے لگا۔ مہر میں ہوا اختلاف۔ بتا نے چاہا شرع محمدی۔ نیگم نے کہا جو غیرت نیگم کا مہر و میرا مہر جیسی نکاحی بی بی و دایسی نکاحی بی بی میں۔ دیر تک اس میں تکرار ہوتی رہی۔ آخر مولوی صاحب جو نکاح پڑھاتے تھے بولے: جانے دو مہر مثل رکھو بتا تو نیم راضی ہو چکا تھا۔ مگر نیگم مہر مثل کے نام سے جھینپتی تھی کیونکہ سارے خاندان میں کبھی کسی کا نکاح ہوا ہو تو مہر مثل ہو دای اور پوہیاں ساری عمر خرچیاں کماتی رہیں مہر مثل آئے تو کہاں سے آئے۔ ناچار مہر شرع محمدی ماننا پڑا اور بات یہ بنائی کہ وہ بھی کیا بی بی بے جو میاں پر مہر کا دباؤ ڈال کر گھر کرے۔ ہم تو بڑا مہر مرد کے دل کو سمجھتے تھے۔ دل مٹھی میں آیا تو جانو سب کچھ پایا وہ کیا غضب کے دوا نکھر تھے کہ ادھر پڑھے گئے اور ادھر فکروں نے آگھیرا۔ نیگم نے نکاح کے بعد پہلی جو بات کی وہ یہ تھی کہ یہ مکان جس میں میں رہتی ہوں تم کو معلوم ہے کہ کرائے کا ہے۔ اور جتنا ساز و سامان جو تم یہاں دیکھتے ہو۔ یہاں تک کہ میرے ہاتھ کا گھنا اور گلے کے کپڑے کوئی چیز میری نہیں۔ میری سگی خالہ میرے ساتھ ہیں یہ سب ان کا مال ہے۔ ان کی ہرگز مرضی نہ تھی کہ میں نکاح کروں اب جو میں نے ان کو ناراض کر کے کیا ہے تو ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔ خالہ بندی میرے پاس ٹھہرنے والی نہیں اور مجھ کو اس وقت کہیں لے چلتے ہو تو میں تیار ہوں اپنی آبرو کا پاس کر کے گھنا کپڑا تو بہتیرا پہناؤ گے اور میں پہنوں گی مگر لے کر چننا ہے تو مجھ کو اپنے یہاں کے کپڑے پہنا کر لے چلو۔ اور دو چار دن کے لیے یہاں ٹھہرنے کی صلاح ہے تو جا کر خالہ سے اجازت لے لو۔ میں ان کے سامنے نہیں جاسکتی۔

بتا نکاح کے لیے تو بڑا مستعجل تھا مگر احمق نے پہلے سے اتنا بھی تو نہ سوچا کہ کہاں دوسری بی بی کو لے جا کر رکھوں گا اور کیونکر اس نئے گھر کا انتظام ہوگا۔

اب جو دفعہ اس کو معلوم ہوا کہ نیگم بے سرو سامان محض بیک بینی و دو گوش اس کے سر پڑی تو بہت سٹ پٹایا اور جتنا اختلاط و معمولی ملاقاتوں میں کر لیا کرتا تھا طبیعت کو اس کے لیے بھی حاصل نہ پایا۔ یہ حقیقت تھی۔ اس خواہش کی جس کے پیچھے بتا اس قدر دیوانہ بن رہا تھا کہ دنیا اور دین اس کو کچھ نہیں سو جھتا تھا۔ اب ایک ذرا ستر دو پیش آ گیا تو کہیں اس

خواہش کا پتہ نہ تھا۔ میر متقی اور عارف اس کو یہی تو سمجھاتے تھے۔ کہ کس فکرِ خسیس میں پڑے ہو۔ فکر کرنے کی باتیں دوسری ہیں عمدہ اونچی اور ضروری۔ اگر ان میں دل لگاؤ تو اس فکرِ بیہودہ سے نجات پاؤ۔ نیگم پر اپنی در ماندگی ظاہر کرتے ہوئے تو اس کو شرم آئی۔ آخر وہ یہ کہہ کر اٹھ آیا کہ ابھی تھوڑی دیر میں بندوبست کر کے تم کو لے چلتا ہوں تیار رہو۔ ایک بات یہ بھی دیکھنے میں آئی کہ آوارہ اور عیاش مزان لوگ دھوکا دینے میں بڑے چالاک ہوتے ہیں اور اس کا سبب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ خود ہمیشہ تخیل مشقِ مغالطات رہتے ہیں۔ بتانا کو بھی عین وقت پر غضب کی سوجھتی تھی۔ جس وقت تک وہ نیگم کے پاس بیٹھا رہا۔ کوئی بات اس کے ذہن میں نہ تھی۔ اٹھ کر باہر آتا تھا کہ اس نے اپنے دل میں کہا۔ نیگم کو اپنے ہی مکان میں بلکہ زنان خانے میں بلکہ غیرتِ نیگم کے ساتھ رکھنا ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ بات چھپنے والی تو ہے نہیں۔ آخر کبھی نہ کبھی کھلے گی ضرور پس جو کچھ ہوتا ہے وہ پرسوں کا ہوتا کل کا اور کل کا ہوتا آج ہو چکے۔ یہ دل میں ٹھان و د گھر کی طرف چلا آ رہا تھا کہ راد میں اس کو اپنے گھر کی دو عورتیں ملیں ماما، ماما کے ساتھ انا، انا کی گود میں بتانا کی دودھ پیتی ہوئی دس گیارہ مہینے کی ننھی بچی۔ چور کی ڈاڑھی میں تنکا۔ بتانا تو سمجھا کہ غیرتِ نیگم کو نکاح کی خبر ہو گئی اور سننے کے ساتھ ہی شاید ناظر کے گھر چلی گئیں۔ اور یہ عورتیں پیچھے سے جا رہی ہیں۔ گھبرا کر پوچھا۔

ماما بولی ننھی بچی کا جی دس بارہ دن سے ایسا ماندہ ہو رہا ہے کہ بخار کسی وقت نہیں اترتا۔ کل شام سے مطلق آنکھ نہیں کھلی۔ اب کے ایسی بھاری نظر ہوئی ہے کہ دوپہر سے دودھ بھی منہ میں نہ تیتیں۔ متوکل شاہ صاحب کے پاس دم کرانے کے لیے جاتے ہیں۔

بتانا کی ایک ڈاکٹر سے بہت ملاقات تھی۔ بتانا لڑکی کو ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اس نے دیکھ کر کہا کہ بخار بڑے زور کا ہے مگر کچھ گھبرانے کی جگہ نہیں کچلیاں پھول رہی ہیں۔ میں مسوڑھا کھولے دیتا ہوں اور شیشی ایک بھیج دینا عرق دوں گا۔ گھٹنے گھٹنے بعد ایک ایک چمچہ پانا پینا آ کر تپ اتر جائے گا۔ اور دودھ تو خدا نے چاہا لڑکی ابھی پینے لگے گی۔ مسوڑھے کی تکلیف کے مارے منہ نہیں چا سکتی۔ یہ کہہ کر نشتر نکال مسوڑھا کھول دیا۔ انا نے پیٹھ مسوڑھ کر دودھ لگایا تو غٹ غٹ پینے کی آواز آنے لگی۔ سب لوگ خوشی خوشی گھر واپس آئے۔ جب مردانے میں پہنچا تو بتانا نے لڑکی کو آپ لے لیا۔ یہ تو خیر لڑکی تھی۔ اس سے بڑا لڑکا معصوم ساڑھے تین برس کا ہوا۔ اس بلا کی باتیں جیسے بنگالے کی مینا اور ایسی پیاری صورت کہ کوئی راد چلتا اس کو دیکھتا تو گود میں اٹھا لیتا۔ بتانا نے کبھی بھول کر بھی آنکھ اٹھا کر اس کی طرف نہ دیکھا۔ بلکہ وہ بچہ جب اس کو دیکھتا ابا کہہ کر دوڑتا اور یہ ظالم دور سے اس کو جھڑک دیتا۔ خلاف عادت بیٹی گود میں لیے ہوئے جو گھر میں گھسا غیرتِ نیگم تو دیکھتے ہی رت بھج گئی۔ اور بیٹی کو لینے کے لیے دوڑی اور لگی پوچھنے کہ میں نے تو اس کو دم کروانے کے لیے بھیجا تھا۔ کیا تم

اس کو الٹا پھر الٹے؟ تم کو خبر بھی ہے اس کی کچلیاں نکل رہی ہیں اور کچلیوں کا تو معمول ہے بچے کو کچلا کر کے بڑی مشکل سے نکلتی ہیں۔ میں اس کو ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔ اس نے نشتر سے اس کا مسوڑھا کھول دیا ہے اور بخار کے لیے عرق دینے کو کہا ہے۔ شیشی بھیج دو۔ ماما جا کر عرق لے آئے۔ خدا نے چاہا آج ہی رات کو بخار بھی اتر جائے گا اور کچلی کو تو سمجھو نکل آئی۔

غیرت نیگم: اے بے کیا مسوڑھے کو چیرا لگایا ہے۔

بتلا: ”کچھ خوف کی بات نہیں۔ ان سے پوچھو کہ لڑکی کو خبر تک بھی نہیں ہوئی۔ اسی وقت تو اس نے خاصی طرح دودھ پیا۔ ڈاکٹر کہتا تھا کہ جب دانت نکلنے کو ہوتا ہے تو مسوڑھا پہلے سے مردار پڑ جاتا ہے۔ اس وجہ سے تکلیف نہیں ہوتی۔ کچھ خدا کو بہتری کرنی تھی کہ عین وقت پر تدبیر ہو گئی۔ ورنہ آج رات بھر معلوم نہیں کیا ہو جاتا“

غیرت نیگم نے لڑکی کا منہ کھول کر دیکھا تو اتنی ہی دیر میں بخار بھی کسی قدر ہلکا ہو گیا تھا اور صورت بھی ہوشیار تھی۔ پکارا بتول بتول! تو ماں کی آواز پہچان کر آنکھیں کھول دیں اور دیکھ کر مسکرائی بھی۔ ماں نے پیار کر کے انا کی گود میں دیا تو پھر دودھ پیا۔ یہ دیکھ کر غیرت نیگم بولی کہ ننھے بچوں کی یہی تو بڑی مصیبت ہے کہ آپ تو منہ سے کچھ نہیں کہہ سکتے اوپر والوں کو کیونکر معلوم ہو کہ ان کو کس بات کی ایذا ہے۔ آنکھوں کا نہ کھولنا اور ڈر ڈر کر اچھل پڑنا اور ہتھیلیوں میں بساندی بساندی بوکا آنا ان باتوں کو دیکھ کر یہاں تو سب یہی کہتے تھے کہ نظر ہو گئی ہے۔

بتلا: ڈاکٹر نے دیکھنے سے پہلے زبانی حال سن کر کہہ دیا تھا کہ دانت نکل رہا ہو گا۔ پھر جو منہ کھول کر دیکھا تو حقیقت میں دور سے کچلی صاف جھلک رہی تھی۔

نیگم: گھر میں کوئی بڑا بوڑھا ہو تو ان باتوں کا دھیان رکھے۔ بچے ذرا ماندے پڑتے ہیں تو میرے ہوش و حواس ٹھکانے نہیں رہتے۔ اب تو مغرب کی اذان تو ہو چکی ہوگی یا ہو رہی ہوگی۔ لڑکی کے جھگڑے میں کھانے کا بھی تو کچھ بندوبست نہیں ہوا۔ گوشت کا تو اب وقت نہیں رہا۔ کہو تو خاکینہ پکوا لوں۔“

بتلا جو تہمارے جی میں آئے پکاؤ۔ مگر خدا کے لیے کوئی سلیقہ مند عورت ضرور رکھو۔

غیرت نیگم: ماماؤں کا تو ہمارے شہر میں ایسا توڑ ہے کہ دوا کے لیے بھی میسر نہیں۔ جو عورتیں اس کام کی ہیں مزے میں گھر بیٹھے ہی گوٹے کناریاں بنتی ہیں۔ یا سلائی کا سیتی ہیں۔ نوکری پرانی تا بعداری کرے ان کی بلا۔ اور جن سے یہ کام ہونے نہیں سکتا۔ انہوں نے سر پر ڈالنا برقعہ اور جدھر کو منہ اٹھا چل کھڑی ہونیں۔ پہر چھ کھڑی بھیک مانگی لدی پھدی گھر لوٹ آئیں۔

بتلا: ”لیکن میرے نزدیک تم کو ماما کی نہیں بلکہ ایسی عورت کی ضرورت ہے جو بال بچوں کی خبر گیری کرے۔ وقت پر ان کا

باتھ منہ دھلائے۔ کھانا کھلائے۔ کپڑے پہنائے گھر کی چیز بست دھرے اٹھائے۔ غرض داروغہ کی طرح گھر کے سارے انتظام کی نگرانی کر کے تم کو آسائش پہنچائے۔“

غیرت بیگم: ”تم ہی کوئی اس طرح کی عورت ڈھونڈ کر نہیں لادیتے۔!“

بتا: ”ا! دوں تو رکھو گی اور کیا تنخواہ دو گی؟“

غیرت بیگم: ”ضرور رکھوں گی اور تنخواہ پانچ روپے اور کھانا کپڑا۔“

بتا: ”خیر اتنی ہی تنخواہ دینا۔ مگر خاطر داری رکھنا۔ لکھنؤ کی ایک عورت ہے۔ خدا جانے کس تباہی میں آ کر یہاں چلی آئی ہے۔ اگر پہننا پرانا ایک جوڑا کپڑا دو تو میں پہننا کرا بھی اس کو لے آؤں۔“

غیرت بیگم نے جلدی سے گٹھڑی کھول ایک جوڑا کپڑا نکال میاں کے حوالے کیا۔ بتا کپڑے لے بیگم کے پاس پہنچا اور اس کو سمجھا دیا کہ اس طور پر میں نے تمہارے گھر لے چلنے کی راہ نکالی ہے۔ مجھے اپنی بلی کا حال معلوم ہے۔ وہ یہی نہیں کہ صورت کی اچھی نہیں بلکہ اس میں عقل کی بھی کوتاہی ہے صورت تو خیر تم چل کر دیکھ لو گی۔ مگر عقل کی کوتاہی اس سے ظاہر ہے کہ اس نے عورت کے لانے کی فرمائش کی بھی تو مجھ سے۔ پس تم کو چند روز البتہ بے عزتی کا خمس کرنا پڑے گا۔ اس کے بعد مجھے کامل یقین ہے کہ تم گھر والی ہو گی اور ودر ہے گی تو تمہاری خدمت کرے گی یا اپنے میکے چلی جائے گی۔

غرض غیرت بیگم کا اتارن پہن معزز ماما داروغہ کا بھیس بنا بیگم بتا کے گھر جا داخل ہوئی۔ بھلے مانسوں کی بہو بیٹیوں کی طرح دبی، جھکی، سکڑی، مٹی، بتا کو تو اتنی جرات نہ ہو سکی کہ خود لے جا کر غیرت بیگم سے ملا دیتا۔ دروازے کے اندر کر کے اتنا پکارا دیا اوصاحب! یہ داروغہ آتی ہے۔ اور آپ مردانے میں جا بیٹھا۔ بیگم نے اپنے تین سنبھالا بہت مگروہ جس قدر اپنے تین چسپاتی تھی اسی قدر اس کا پردہ فاش ہو جاتا تھا۔ آئی تو نوکروں کے نام سے اور عورتوں میں بیٹھی، دہنوں کی طرح گھونگھٹ نکال کر رات کا وقت تھا۔ غیرت بیگم نے کہا ذرا روشنی قریب لادو تو ان کی صورت اچھی طرح نظر آئے۔ جوں غیرت بیگم نے زبردستی کا منہ کھولا۔ دیکھتی کیا ہے کہ ایک عورت جو ان ماتھے پر افشاں چنی ہوئی، پٹیاں جبی ہوئیں، لٹے بل کی چوٹی اور اس میں چمپا کا موباف۔ کانوں میں چنبیلی کی کلیاں، آنکھوں میں دھواں دھار سرمہ مسمی کی دھڑی اور دھڑی پر لاکھا۔ باتھ پاؤں میں مہندی، دور سے خوشبو پڑی مہک رہی ہے۔ غیرت بیگم دیکھنے کے ساتھ اس طرح ڈر کر پیچھے کو ہٹتی کہ جیسے کوئی بچہ پچا سے بھاگتا ہے۔ اور لگی کہنے: اوئی بیوی۔ یہ ماما کس قسم کی یہ تو کوئی نامراد کنجی ہے پھر تو مسائے تک کی عورتیں گھر میں آ بھریں اور سب نے مل کر بیگم کا ایسا براہڑا کیا کہ کوئی دو پٹہ اتارے لیے جاتا ہے کوئی پیچھے سے چوٹی گھسیٹ رہا ہے۔ مگر کسی رحم دل بی بی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر ڈیوڑھی میں لے جا کر چھوڑ دیا اور کہاں: بیوی بنو جدھر سے

آئی بے ادھر ہی کو چلی جا۔ وہ تو گھروالی دل کی بڑی نیک بے۔ کوئی اور دوسری ہوتی تو بے ناک چوٹی کاٹے نہ رہتی۔ بتانا ڈیوڑھی کے بازو سے لگایہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ کچھ ہنسی کچھ غصہ۔ بیگم کو دیکھتے ہی بولا: وا دا اچھی اپنی گت کرائی۔ باوجودیکہ میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ میں تم کو نوکری کے حیلے سے لیے چلتا ہوں۔ پھر تم کو ایسا بن سنو کر آنا اور اتنا لمبا چوڑا پردہ لگانا کیا ضرور تھا۔ سیدھے سبھا چلی آئی ہوتیں نہ کسی کوشبہ ہوتا اور نہ چراغ لے لے کر کوئی تمہارا منہ دیکھتا۔ خیر اب ذرا کی ذرا یہاں ٹھہرو میں تمہاری پٹش جماتا ہوں مگر دیکھو خبردار کوئی ایسی بات نہ کرنا جس سے لوگوں کو میرے تمہارے لگاؤ کا شبہ ہو۔ بتانا نے گھر کے اندر پاؤں رکھتے ہی پوچھا لڑکی کا کیا حال ہے۔ انا بولی اب تو اللہ کا فضل ہے۔ دوبار عرق پایا اس قدر پسینہ آیا کہ شام سے تین کرتے بدل چکی ہوں۔

بتانا: ”بس انشاء اللہ اب بخار گیا۔ بارے اب الحمد للہ بیچ گئیں۔ (بیوی کی طرف مخاطب ہو کر) اے صاحب کھانا تیار ہو تو منگو اؤ۔ دسترخوان بچھا عادت کے مطابق میاں بی بی کھانا کھانے بیٹھے تو بتانا نے پوچھا۔ کیوں صاحب وہ عورت آئی تھی۔ غیرت بیگم: ”واہ چوری اور سینہ زوری آتے کو بڑے ماموں جان زندہ ہوتے تو اٹے استرے سے مردار کا سر منڈوا کر بھی بس نہ کرتے اور تم کو تو اپنی لائے کا لحاظ پاس آتے کیا برسوں سے نہیں۔ بڑے ماموں جان کی زندگی تک چوری چھپے کرتے تھے۔ وہ مرے تو تم کھل کھیلے۔ مردانہ مکان تو مدتوں سے کنچوں کا دھکلا ہو رہا ہے۔ ایک زمانہ مکان بچا تھا سو میں خوب جانتی ہوں کہ تم اس کی تاک میں لگے ہو۔ مگر جب تک میں جیتی بیٹھی ہوں دیکھوں تو کون رستم کی جی میری ڈیوڑھی کے اندر پاؤں رکھتی ہے۔ اپنا اس کا خون ایک کر دوں تو سہی۔“

بتانا: ”بے وجہ بے سبب تم اس قدر گرم کیوں ہوتی ہو۔ بھلا اتنا تو سمجھو اگر وہ کنچنی ہوتی اور فرض کرو کہ اس کو بلانا منظور ہوتا تو مردانہ ہوتے ساتھ مجھ کو اسے گھر میں لانے کی کیا ضرورت تھی ایک اور دوسرے خدا تعالیٰ دے تو سمجھنے کے لیے ایک موٹی بات یہ ہے کہ تمہارے مانگے کپڑے پہن کر کیوں آتی۔

غیرت بیگم: ”کپڑا اور گہنا تو بے شک اس کے پاس نہ تھا مگر سر سے پاؤں تک چوتھی دہن معلوم ہوتی تھی۔“

بتانا: تم کو چاہیے تھا کہ مجھ کو بلا کر پوچھتیں۔ اگر میں تمہاری تشفی نہ کر سکتا۔ تب بھی اس بے چاری کا کیا قصور تھا۔ مجھ پر جتنا چاہتیں خفا ہوئیں۔ بات یہ ہے کہ حقیقت میں وہ آج شاموں شام تک کنچنی تھی۔ مگر میں اس کو ایک مدت سے جانتا ہوں ہمیشہ یہ مجھ سے کہا کرتی کہ مجھ کو اس پیشہ سے سخت نفرت ہے۔ اگر کہیں میری روٹی کا ٹھکانہ لگ جائے تو میں تائب ہو جاؤں۔ جب تم نے نوکر رکھنے کا وعدہ کیا تو میں نے اس کو زبان دی اور وہ ارادے کی ایسی کچی تھی کہ فوراً میرے ساتھ ہو لی۔ اور پھر کس طرح کہ گہنا اور پاتا اور کپڑا اور لتا اور ساز و سامان یعنی بھرا بھرا گھر سب کو الات مار کر جس طرح بیٹھی تھی

اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے بے شک جھک مارا اور میرا بال بال خدا کا اور تمہارا گنہگار بنے۔ مگر جس دن سے چچا باوا تشریف لائے تم میری کوئی ایک بات بتاؤ اور یوں اگر تمہارے مذہب میں تو بہ کوئی چیز نہیں اور ناحق بدگمان رہو تو تمہاری خوشی بھلا تم نے چند روز تو اس بے چاری غریب کو رکھ کر دیکھا ہوتا۔ جو شخص آٹھوں پہر آنکھوں کے سامنے رہے۔ اس کا حال آج نہیں تو کل اور کل نہیں تو پرسوں ضرور کھلے گا۔ نوکر سر ایش نہیں ہے کہ چٹ جائے۔ مرضی ہوئی رکھا۔ مرضی نہ ہوئی نہ رکھا۔ مگر چونکہ میرا قدم در میان ہے۔ میں تم سے بات کہوں صاف یوں بے خطا بے قصور تو میں اس کو ادھر نہیں چھوڑ سکتا۔ تم ہی بتاؤ کہ وہ جائے تو کہاں جائے۔ غیرت بیگم ابھی کچھ ہاں نہ کرتے نہیں پائی تھی کہ بتلانے کہا ماما جابا ہر ہریالی ایک عورت کھڑی ہے اس کو بلال اور کام کانت میں اس سے مدد لیا کر۔ غرض ہریالی نکالی جا کر پھر آمو جو ہوئی۔ رات گئی تھی۔ زیادہ اوگ کھانی کراپنی اپنی جگہ سو سلا رہے۔ ہریالی بھی تخت پر بے نیکی بے بچھو نے ماماؤں میں سوئی۔ صبح کو جو اٹھے تو پھر لوگوں نے ہریالی کو گھورتا شروع کیا۔ مگر اب اس کا سنگھار ہو گیا تھا باقی۔ اور تمام شب کی بد خوابی اور زحمت کی تکان سے اس کا جو بن بھی نڈھال ہو رہا تھا۔ لوگوں نے کچھ بہت اس کا پیچھا نہیں کیا۔ اس میں شک نہیں کہ گھر میں ایک منتظم عورت کی سخت ضرورت تھی اور یہی ضرورت ہریالی کے پاؤں جم جانے کا سبب ہوئی۔ ہریالی نے جو صبح سویرے اٹھ کر دیکھا تو تمام اسباب مولی گاجر کی طرح سارے گھر میں پھیلا پڑا ہے۔ اس نے خود کھڑے ہو کر جہاں جہاں فرش تھا اٹھوا کر دالانوں میں صحنوں میں دروں میں باورچی خانے میں یہاں تک کہ ڈیوڑھی میں جھاڑو دلائی، نوکروں میں چمکڑوں کوڑا نکالا اور بہت سی گری پڑی چیزیں ملیں، جن کو ڈھونڈ ڈھونڈ صبر کر کے بیٹھ رہے تھے اور سمجھ لیا تھا کہ کھوئی گئیں، مٹی کی تہیں جتے جتے دریاؤں کا یہ حال ہو گیا تھا کہ اصل رنگت پہچان نہ پڑتی تھی جھڑوایا تو منوں گرد دروازوں میں جو چائیں اور پردے بندھے تھے، اٹے سیدھے کا تو کس کو امتیاز تھا، کوئی دھرتک بندھا ہے تو کوئی آدھے در میں پڑا الٹک رہا ہے۔ اور کسی کا لپیٹ ایک طرف کو جھک کر نکل پڑا ہے تو اتنی تو نیک نہیں ہوئی کہ اس کو برابر کر دیں۔ بلکہ کئی پردوں میں سے تو فاختاؤں اور جنگلی کبوتروں اور گلہریوں کے گھونسے نکلے۔ گھر میں تخت تو بہتر ہے ہیں مگر بیٹھنے کے لیے دالانوں میں زمین پر بورے بچھے ہیں۔ بوریوں پر دریاں، دریاؤں پر چاندنیاں، لونڈیاں اور مائیں ہیں کہ بے تکلف مٹی اور کچھڑ کے ننگے ننگے پاؤں پر لیے پھرتی ہیں۔ اور چاندنیوں کا مارے دھبوں اور چکٹوں کے یہ حال ہو رہا ہے کہ آنکھ اٹھا کر دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ صبح سے کھڑے کھڑے ہریالی کو دوپہر ہو گئی تب کہیں جا کر اتنا کام ہوا کہ گھر میں جھاڑو دی گئی، دالانوں میں اس حساب سے تخت بچھوائے کہ بیچ میں فرش اور ادھر ادھر ماماؤں اور لونڈیوں کے چلنے پھرنے کی جگہ اب چاندنیوں اور تکیوں کے غلاف اور پانگوں کی چادروں کی ڈھنڈیا پڑی۔ قاعدہ ہے کہ جب چیزوں کا انتظام نہیں تو ہوتا یہی شناخت ہے کہ چیزوں کی حفاظت

بھی نہیں۔ اتنا بڑا گھر اور اس وقت دھوئی ہوئیں تین چاندنیاں درکار تھیں وہ بھی نہیں ماتی تھیں۔ غیرت بیگم نے بہتیرے پتے بتائے۔ ارے کم جستجو بھی ہفتے بھرے کا ذکر ہے۔ دھوبن چاندنیوں کا گھڑائی۔ وہ سب ڈھیر کا ڈھیر کیا ہو گیا۔ لٹھے کی کوری چاندنی جو بیچ کے دالان میں بچھی تھی اور پرسوں اتروں اس پر سان کی دیکھی مبارک قدم کے ہاتھ سے الٹ پڑی تھی اور میں نے صاف کرنے کے لیے اٹھوا دی تھی، کہاں ہے۔ جتنی کھڑی تھیں ایک ایک کا منہ دیکھتی تھیں اور ایک ایک پر ہلاتی تھیں۔ آخر بڑی مشکل سے دو چاندنیاں امان کی کوٹھڑی کی مچان پر پڑی ملیں۔ جن میں چوبہوں نے کاٹ کاٹ کر بغارے ڈال دیئے تھے اور ایک میں کسی ماما نے سوکھے مکڑے باندھ کر کھوٹی پر لٹکا رکھے تھے۔ اس جستجو میں معلوم ہوا کہ کئی چاندنیاں باہر سائیس کے پاس ہیں اور وہ اوڑھ کر سوتا ہے۔ دو یا تین چاندنیاں کسی کو مانگے دی تھیں۔ وہ واپس نہیں آئیں۔ پہلی چاندنیوں کا ایک ڈھیر غسل خانے میں پڑا ملا۔ غرض اس وقت ہریالی نے کسی طرح گوئھ گوئھ کر فرش کو پورا کیا۔ پلنگ سب کے سب جموا ہو رہے تھے۔ ان کو کسوا جلی چادریں بچھوا دیں۔ تکیوں کے غلاف بدلے۔ اجا دستر خوان نکلوایا۔ اتنے میں معلوم ہوا کہ میاں (بتا) کھانے کے لیے آ رہے ہیں۔ ہریالی یہ سن کر سامنے سے ٹل گئی۔ باورچی خانے کے آڑ میں ہو گئی۔ بتا نے آ کر دیکھا تو اتنی ہی دیر میں گھر کی صورت بدلی ہوئی تھی۔ سمجھا کہ یہ سب ہریالی کے تصرفات ہیں۔ دالان میں بیٹھ کر کھانا مانگا۔ تو باورچی خانے سے دو اوٹیاں سالن کی دو دور کابیاں لے کر چلیں۔ پیچھے سے ایک ماما ہاتھ میں روٹیوں کی تھنی اٹھا کر دوڑی۔ ہریالی سے نہ رہا گیا۔ سین وقت پر کیا ہو سکتا تھا مگر خیر ان جانیوں کو روک کر جلدی جلدی تھالی جوڑ پانی پینے کی صراحی، سینی، سلنگی، خاصدان، اگالداں سب چیزیں منجھوائیں۔ سینی کے بیچ میں روٹی گر داگر دالان کی رکابیاں جما اوپر سے خوان پوش ڈھک، ایک اوٹھی کے سر پر رکھا سمجھا دیا کہ دیکھ خبردار آگے دیکھ کر آہستہ آہستہ چہنا کہیں ٹھوکر نہ لگے۔ اور دوسری اوٹھی کو سلنگی، آفتابہ، اجا دستر خوان دے کر اس کے ہاتھ کیا کہ پہلے تخت کے نیچے کھڑی رہ کر میاں بی بی دونوں کے ہاتھ دھو لے۔ جب جب ہاتھ دھو چکیں سلنگی آفتابہ الگ رکھ کر دونوں کے بیچ میں اجا دستر خوان بچھائیو اور سینی احتیاط کے ساتھ اتروا کر روٹیاں بیچ میں رکھو دو قسم کا سالن ہے۔ دونوں کے سامنے دونوں قسم کا رکھ دیجیو۔ تھالی جوڑ اور پانی پینے کی صراحی پیچھے سے بھجاتی ہوں۔ جب مانگیں تو خبردار آدھے کٹورے سے زیادہ بھر کر نہ دینا اور پانی جو پلانا تو جھک کر کٹورا آگے کر دینا کہ خود اپنی آنکھ سے دیکھ لیں اور تھالی منہ کے نیچے رکھنا کہ پانی کپڑوں پر گرنے نہ پائے۔

گھر میں چٹنی، اچار، مرہ، سبھی کچھ تھا مگر دستر خوان پر رکھنے کا دستور نہ تھا۔ جس کسی کو بھی کسی چیز کا خیال آ گیا اور منہ پھوڑ کر مانگی تو مرتبان یا اچار اس کے پاس لے جا کر روٹی پر ایک پھانک رکھ دی۔ ہریالی نے چار قسم کی چار پیالیاں ایک رکابی

میں لگا ابھی کھانا شروع نہیں کرنے پائے تھے کہ پہنچا دیں۔ کھانے بعد ہاتھ دھونے کا گرم پانی کا آفتابہ اور ایک طشتری میں تین کھانے کو خاصدان میں بیگی ہوئی صافی سے لپٹی ہوئی گلو ریاں پہلے سے تخت پر رکھا دیں۔ یہ تو ہریالی کے پہلے دن کے بلکہ پورا دن بھی نہیں دوپہر کے اور جلدی کے کام تھے مہینے بھر کی محنت میں اس نے کپڑے کا کھانے کا سامان خانہ داری کا اندر باہر دونوں جگہ کے نوکروں کا بازار کے سودا سلف کا سب انتظام کر دیا۔ سلیقہ بھی عجیب چیز ہے۔ اندر باہر عورت مرد جتنے نوکر تھے آپ سے آپ سب ہریالی کا ادب کرنے لگے۔ معصوم ایسا بلا کہ دن رات میں ایک دم کے لیے گود سے نہیں اترتا تھا۔ بتول کی کیا بساط تھی، کیسی ہی بھڑکتی ہوئی آواز سنی اور چپکی ہوئی۔ غیرت بیگم کے دل میں اس کی طرف سے شک تھا تو مگر ہر چند ٹوڈ لگائی کوئی بات نہ پکڑ پائی۔ بتالا کے گھر میں آنے کے وقت مقرر تھے ہریالی ان وقتوں میں ابد اگر کسی نہ کسی بہانے سے ٹل جاتی تھی اور اگر اسیاناً بضرورت سامنے چلی پھری بھی تو ایک دوسرے سے ایسے بے رخ بن جاتے تھے کہ تعلق کیسا گویا جان پہچان تک بھی نہیں۔ مگر خدا جانے دونوں کا کیا ڈھب یا دھما کہ اتفاقاً اچھٹی ہوئی ایک نگاہ ان کے حق میں خلوت کا حکم رکھتی تھی۔ نہیں معلوم بتالا آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ دیا کرتا تھا کہ ہریالی برابر سرگرمی اور دل سوزی کے ساتھ گھر کے انتظام میں مصروف رہتی تھی۔ سچ ہے کہ غیرت بیگم کے ساتھ بتالا کے دل کے نہ ملنے کا بڑا سبب تھا۔ بتالا کی حسن پرستی اور آوارگی۔ مگر اتنا قصور تو غیرت بیگم کا بھی تھا کہ اس نے بتالا کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے ذرا بھی کوشش نہیں کی۔ وہ سمجھی جیسا کہ گھر کی بیبیاں اکثر سمجھا کرتی ہیں کہ جب ماں باپ نے میاں کے ہاتھ میں ہاتھ پکڑا دیا تو بس مجھے اپنی طرف سے کچھ کرنا نہیں۔ اب میاں کا کام ہے کہ کما کر لائے اور مجھے کھلائے پہنائے۔ میری خاطر داری و مدارت کرے۔ لیکن اس کو اتنی بات اور سمجھنی چاہیے تھی کہ کھانا اور پہنانا خاطر داری و مدارت کرنا۔ سب چیزیں متفرع ہیں رغبت پر رغبت کرنا میاں کا کام اور دانا بی بی کا۔ رہی یہ بات کہ بی بی کیوں کر میاں کو رغبت دلائے۔ اس کے لیے کوئی ایسا قاعدہ نہیں کہ ہر جگہ چل سکے۔ کیونکہ ہر ایک کا مزاج مختلف اور ہر شخص کی رغبت جدا۔ لیکن بی بی اگر چاہے تو اس کو اپنے میاں کی رغبت کا معلوم کر لینا کیا مشکل ہے۔ مثلاً غیرت بیگم اتنا تو دیکھتی تھی کہ بتالا کیسی صفائی اور کس شان کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ ہر چیز میں حسن چاہتا تھا۔ خیر حسن صورت بتالا کی پسند کے لائق تو اختیاری بات نہ تھی۔ مگر جس قدر اختیاری تھی غیرت بیگم نے اتنی ہی کر کے دکھائی ہوتی۔ گھر کی صفائی ستھرائی، ساز و سامان کی درستی، انتظام کی خوبی یہ بھی داخل حسن ہیں اور طبیعت میں سلیقہ ہو تو ہاتھ پاؤں کے اور غیرت کے تو زبان کے بلانے سے سب کچھ ہو سکتا تھا۔ مگر اس نے ان چیزوں کی طرف کبھی بھول کر بھی توجہ نہ کی۔ مردانے مکان میں میاں کی بیٹھک تھی۔ اسی کو دیکھ کر متنبہ ہوئی ہوتی اس کا اپنا کیا حال تھا۔ کہ میاں کو جو شروع شروع میں اپنی طرف سے بے رخ پایا تو تین تین چار چار دن سر میں لگنے لگا۔



اونڈیوں کے تقاضے سے دسویں بندر تھویں سر دھویا بنے تو بالوں میں تیل کی خبر نہیں پھولے پھولے، روکھے بال دور سے ایسا معلوم ہوتا کہ کڑک تاتھ کڑک مرئی بیٹھی ہے۔ آنکھوں میں سرمہ نہیں ہاتھ پاؤں میں مہندی نہیں، پھول نہیں، عطر نہیں، گونا نہیں، کنارہ نہیں، غرض عورتوں کے سنگھار کی کوئی چیز نہیں، بتانا کو پہلے استکرا دتھا، غیرت نیگم کی بے تدبیر یوں نے استکرا کو نفرت اور نفرت کو ضد اور ضد کو چڑ بنا دیا۔ صورت شکل میں ہریالی کچھ غیرت نیگم سے زیادہ اچھی نہ تھی مگر چھٹانک بھر حسن ہوتا ہے تو غور پرداخت سے دیکھنے والوں کی نظر میں سیر بھر جتنے لگتا ہے۔ سو غور پرداخت کے عوض غیرت نیگم تو یہ چاہتی تھی کہ ابٹنے کی جگہ تھوڑی سی کیچڑ ملے تو اٹھا کر منہ کو مل لوں۔ میاں بی بی میں جب اختلاف مزاج اس درجے کا ہو تو ان میں صحبت برآ ہونے کی کیا امید۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چھاتی پر مونگ دلنے کے لیے آخر ایک سو کن تو آ موجود ہوئی۔ ہریالی کا انتظام دیکھ دیکھ کر غیرت نیگم کا پھو ہڑ پن بتانا کے دل میں بیٹھا چلا جاتا تھا۔

## غیرت بیگم پر اپنی سوکن کے راز کا فاش ہونا

معلوم نہیں بتایا کہ کب تک ہریالی کا اس نہج پر رکھنا منظور تھا کہ ایک دن گھر میں باہر سے اطلاع پہنچی کہ ایک بوڑھی عورت نوکری کی تلاش میں آئی ہے۔ اگر حکم ہو اندر بھیج دیں۔ انتظام خانہ داری تو سب ہریالی کے ہاتھ میں تھا۔ غیرت بیگم نے ہریالی سے پچھوایا۔ ہریالی کسی کوٹھڑی میں خدا جانے کس کام میں مصروف تھی۔ اس نے وہیں سے کہا کیا مضائقہ، غرض وہ عورت اندر آ کر سیدھی غیرت بیگم کے پاس جا بیٹھی۔ اور لگی کہنے کہ ہریالی بیگم کے پاس آئی ہوں جن کو تمہارے میاں نکاح پڑھوا کر نکال لائے ہیں۔ مدت سے ان کے یہاں اوپر کام پر نوکرتھی بیگم کو تو نکلے ہوئے تین مہینے ہونے کو آئے ہیں میں ان کی خالہ کے پاس رہی۔ آج آٹھواں دن ہے کہ وہ بھی لکھنؤ سدھاریں۔ میں نے کہا چلو اگر بیگم پھر رکھ لیں تو میں ان کے مزاج سے واقف ہوں وہ مجھ کو جانتی پہچانتی ہیں انجان جگہ تا بعداری کرنی کیا ضرور کیا وہ اس گھر میں نہیں رہتیں! غیرت بیگم نے ہاتھ سے اشارہ کر کے بتایا کہ تم جن کے پاس آئی ہو وہ سامنے کوٹھڑی میں ہیں۔ وہ عورت اٹھ کر کوٹھڑی کی طرف چلی۔ دروازے تک پہنچی تھی کہ اتنے میں غیرت بیگم بے خود ہو کر گولے کی طرح اٹھی وہ عورت ہریالی سے ابھی بات بھی نہیں کرنے پائی تھی کہ اس نے پہنچ کر بے چاری بڑھیا کو اوندھے منہ ہریالی پر دھکیل دیا۔ اور کہا کہ تم نے دیکھا یہ ہریالی نہیں گھر والی ہے یہ بی بی ہے یہ میری سوکن ہے۔ میں رائٹ ہوں یہ سوہاگن ہے۔ میں اونڈی ہوں یہ بیگم ہے میں چڑیل ہوں یہ جو رہے یہ میاں کی لاڈلہ ہے۔ یہ میاں کی چہیتی ہے۔ یہ میاں کے کچے کی ٹھنڈک ہے۔ یہ کہتی جاتی تھی اور اس کے ساتھ ہزار ہا گالیاں اور سینکڑوں کو سننے اور دہنتر تھا کہ باری باری سے اس شامت کی ماری بڑھیا اور ہریالی پر اور اپنے آپ پر بھی اس زور سے پڑ رہا تھا کہ گویا مزدور سڑک کوٹ رہے ہیں۔ گھر میں بہتیری اونڈیاں اور مامائیں تھیں مگر سیدانی کا جال دیکھ کر کسی کی ہمت نہ پڑ سکی کہ کوٹھڑی کی طرف رخ کرے۔ سب کی سب بدحواس ہو کر بھاگ کھڑی ہوئیں۔ ہمسائے کی عورتیں کوئی کھڑکیوں میں سے کوئی دیوار سے کھڑی جھانکتی تھیں پر کسی سے اتنا نہیں ہو سکتا تھا کہ گھر کے اندر قدم رکھے، بتایا کہ وہ کھلوایا تو وہ بھی اس وقت کہیں باہر گئے ہوئے تھے مردانے میں ٹٹروں ٹوں اکیلا وفادار اس کو اور تو کچھ نہ سوچھی، گھوڑا تو دروازے پر بندھا ہوا تھا ہی منہ میں لگام سے ننگی پیٹھ سوار ہو گاٹ سیدھا پہنچا کچھری میں سیدناظر کے پاس، ناظر اسی گھوڑے پر چڑھ دھم سے آمو جوہوئے اور اتفاق سے سید حاضر بھی کسی ضرورت سے دو تین دن کے آئے تھے کچھری ان کے پاس بھی آدمی دوڑا دیا کہ آپ بھی جلد آئیے غرض سید حاضر اور بتایا بھی آگے پیچھے پہنچ گئے غیرت بیگم سید حاضر کے آنے سے پہلے کھڑی اور پڑی اتنا پیٹی اتنا پیٹی کے آخر اس کو نش آ گیا۔ ناظر جس وقت پہنچا کہ وہ بالکل بے ہوش

پڑی تھی۔ ناظر نے آنے کے ساتھ اس کو ہوش میں لانے کی تدبیریں شروع کیں۔ سید حاضر اور بتلا دونوں آئے ہیں اس کے بہت دیر بعد غیرت نیگم کو ہوش آیا۔ سب سے زیادہ چوٹ غیرت نیگم کو ہی لگی کہ اس نے پیٹ پیٹ کر اپنا سارا بدن چوڑی کی طرح نیا کر لیا تھا ہریالی کی بھی کندی خوب ہوئیں۔ مگر اس کو لگی مار لگی تھی۔ بڑھیا اور ہریالی کو ٹھڑی کی دیوار کے نیچے میں آکر بچ گئی مگر وہی مثل ہے کہ مرغی کو تکلے ہی کا گھاؤ بہت ہوتا ہے۔ دو تین دو ہنر جو اس پر جمے ہوئے بیٹھ گئے۔ وہ اتنے ہی میں سسکیاں لینے لگیں اگر ناظر ہوتو کو تو الی والے کیا اس مقدمے کو بے چالان کئے رہیں تو بے اور اگر حاضر نہ ہوتا تو ناظر اور بتلا آپس میں کٹ مریں۔ پانچ چھ دن کو بیماروں کی دوا دارو ہوتی رہی۔ اندھنے کے موقع پر آنے بلدی کا حلو ا پکا پکا کر باندھا سینکے کی جگہ پر آنے روڑ اور ریرہ سے سینکا۔ پھٹکری کو دودھ میں جوش کر کے پایا۔ اب کیا باقی رہ گیا تھا جس کے لیے بتلا کو ہریالی سے ملنے کا تامل ہوتا۔ حاضر ناظر بہن کی خدمت گزاری میں لگے تھے اور بتلا کھلم کھلا ہریالی اور اس کی بڑھیا بارے جب سب کے ہوش و حواس درست ہوئے تو لگے اپنی اپنی جگہ صلاحیں کرنے، بتلا اور ہریالی نے تو یہ مصلحت گٹھی کہ اب اتنی گھر میں برابری کے داعیہ سے رہنا اور جلتوں کو خوب جانا۔ ادھر حاضر ناظر غیرت نیگم کے آپس ہی میں پھوٹ تھی۔ ناظر کہتا تھا کہ ابھی لگے ہاتھ پہلے تھانے میں اطلاع لکھوا کر ایک دم سے تین ناشیں تو فوجداری میں داغو۔ مداخلت بے جا کی ہریالی پر اور ضرر رسانی اور اپنے دونوں بچوں کے نفقے کی امید پر اور ایک دعویٰ مہر کا کاغذ کامل التیمت پر دیوانی میں دائر کرو غیرت نیگم معاملے مقدمے کچھ سمجھتی بوجھتی نہ تھی۔ وہ اپنی اس ایک بات پر اڑی ہوئی تھی کہ مجھ کو سید نگر پہنچاؤ نہیں تو ایفون کھاتی ہوں۔ سید حاضر تھا میرفتی صاحب کے خوشہ چینوں میں اور بات کے انجام کو سوچتا تھا۔ اس کی رائے یہ تھی کہ نہ تھانے میں اطلاع لکھواؤ نہ سرکار دربار میں کسی طرح کی ناش فریاد کرو نہ سید نگر جاؤ نہ ایفون کھاؤ، صبر کر کے چپ چاپ گھر میں بیٹھی رہو۔ سوکن کا آنا تمہاری تقدیر میں تھا سو ہوا۔ اب تمہارے شور و فساد سے بہت ہو گا تو شاید اس گھر سے نکل جائے، مگر تم اپنے میاں کو اس کے چھوڑ دینے پر مجبور نہیں کر سکتیں، تم جو سید نگر جانے یا ایفون کھانے کو کہتی ہو یہ تمہاری نامراد سوکن کی عین مراد ہے۔ ناظر بھائی نے جو تدبیر بتائی اس کا خلاصہ یہ ہے۔ لڑائی اور لڑائی کا ضروری نتیجہ نقصان اور تر دوا و رضیحت اور رسوائی، اب تو سوکن کے آنے سے تم کو صرف ایک حیاتی تکلیف پہنچی ہے، اور تم ایفون کھانے کو موجود ہو۔ لڑائی کی صورت میں بہت سی واقعی تکلیفیں ایسی پیش آئیں گی کہ شاید تمہارے ساتھ مجھ کو اور ناظر بھائی کو بھی ایفون کھانی پڑے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سوکن کے آنے پر تم اس قدر آپے سے باہر کیوں ہو۔ کیا سوکن تم پر آج آئی ہے تمہارا تو بیاہ ہوا ہے پیچھے اور سوکنیں تمہارے پیادہ سے بہت پہلے کی آئی ہوئی موجود تھیں کیا تم کو معلوم نہیں، تم ہی بتاؤ کہ بتلا بھائی کس دن بے سوکن کے رہے۔ سارا سید نگر جانتا ہے میں نے تمہاری منگنی کے وقت بہتیرا نکل مچایا مگر میری سنتا کون

تھا۔ میں تو تمہارے نصیبوں کو اسی دن سے روچکا۔ جس دن تمہاری سمجھ کا پھیر بنے۔ ورنہ میں تو حقیقت میں اس بات کو سن کر بہت خوش ہوا تھا کہ بتلا بھائی نے نکاح پڑھالیا۔ اس سے تو یہ پایا جاتا ہے کہ انہوں نے آوارگی سے توبہ کی، کوٹھوں کوٹھوں سر بازار خدائی خوار پڑا پھرنا بہتر یا ایک کا ہو رہنا، اور اس کو اپنا کر لینا بہتر تم کیسی مسلمان ہو کہ ایک شخص جب تک خلاف شرع چلتا رہا۔ تم نے ہوں تک نہ کی، اس کا طریقہ شریعت پر آتا تھا کہ تمہارے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ ہم تو بھائی ایسے دین و ایمان کے قائل نہیں۔ بلکہ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ بتلا بھائی نے تمہارا بڑا لحاظ کیا کہ نکاح کو تم سے چھپایا اور تمہاری خاطر سے بی بی کو ماما بنایا اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر تم پر وہ فاش نہ کرتیں تو بتلا بھائی اس عورت کے ساتھ اپنے معاملے کو اسی طرح دبا دبا یا رہنے دیتے مگر تم نے بیٹھے بٹھائے سوئی ہوئی بھڑوں کو جگایا۔ ان کو حیلہ ہاتھ آیا اب اگر وہ اس عورت کی اور بڑھیا کی دلجوئی اور خبر گیری نہ کرتے تو سارا گھر کچا کچا پھرتا میں نے تو جس وقت آ کر بڑھیا کو دیکھا، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرے تو ہوش اڑ گئے تھے۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے برف، چہرے کی رنگت متغیر، میں تو سمجھا خدا جانے کہاں بے موقع صدمہ پہنچا کہ اس کا سانس پیٹ میں نہیں سماتا۔ پوچھو میاں ناظر سے اخباروں میں کئی بار دیکھنے میں آیا کہ کسی گورے نے ایک قلی کو تھپڑ مارا۔ یا ٹھکرا دیا اور قلی فوراً مر گیا۔ غیرت بیگم تم نے یہ بڑی سخت بے جا حرکت کی، اور تم اس طرح دست درازی کرو گی، تو یقیناً جانو تم اپنی تو اپنی ایک نہ ایک دن سارے خاندان کی ناک کٹوا دو گی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے چند بد نصیب بندے یعنی لونڈیاں جو تمہارے اختیار میں ہیں تم حق ناحق اپنا غصہ ان پر نکالتی رہتی ہو۔ یہ بے چاریاں تمہارا کچھ کر نہیں سکتیں ہاتھ چھوٹا ہوا طبیعت بڑھی ہوئی تم سمجھیں کہ سب جانور ایک ہی المٹھی سے ہانکے جاتے ہیں، سو کن اور بڑھیا دونوں کو اٹھا کر پیٹ ڈالا۔ گویا وہ تمہاری لونڈی ہے۔ اور یہ تمہاری باندی وہ تو خدا نے اتنی خیر کی کہ بڑھیا مری نہیں اور ادھر عین وقت پر آ پہنچے، میاں ناظر کہ ان کے ملاحظے سے کوٹوالی والوں نے تھوپ تھاپ کر دی۔ ورنہ ماری شیخی کر کر رہی ہو جاتی۔ کہ سادات سید گمر کی بیٹی میر مہذب کی بہو کی ڈولی کوٹوالی کے چبوترے پر دھری ہوئی۔ صدا فرین ہے، تمہاری سو کن پر، بے تو ذات کی کچنی مگر بڑی ضبط کی آدمی ہے، کہ تم سے کہیں زبردست معلوم ہوتی ہے۔ مگر چپکلی مار کھلیا کی اور الٹ کراف تک نہ کی، کیوں غیرت! جیسا تم نے اس کو مارا تھا، اگر وہ بھی برابری سے مارتی، تو ہماری عزت دو کوڑی کی ہو جاتی۔ مگر اتنا فائدہ تو ضرور تھا کہ پھر تمہارا ہاتھ کسی پر نہ اٹھتا، سید حاضر نے ناظر اور غیرت بیگم کو ایسا آڑے ہاتھوں لیا کہ دونوں کو کچھ جواب نہ بن پڑا اور دونوں اپنا اپنا سامنہ لے کر رہ گئے۔ آخر ناظر بولا کہ آپ ہم دونوں سے بڑے ہیں، جو کچھ آپ کے نزدیک مناسب ہو، اس کی تعمیل میں نہ مجھ کو عذر ہے، اور نہ آپا کو۔ یہ معاملہ ناموس کا ہے اور بھائی بہنوں کی ناموس کچھ جدا جدا نہیں ہوتی۔ اس میں رتی برابر فرق نہیں کہ آپ جو کچھ کریں گے، آپا کے حق میں بہتر ہی کریں گے، سید حاضر

نے کہا بس تو مجھ کو بتا بھائی سے دو باتیں کر لینے دو۔ انشاء اللہ میں کوئی ایسی راد نکالوں گا کہ دونوں میاں بیوی میں غنائی ہو جائے۔ ایسا موقع تاکر جب بتا مردانے میں اکیلا تھا، سید حاضر خود اس کے پاس گئے، جس وقت سے گھر میں یہ واردات ہوئی تھی۔ حاضر اور ناظر دونوں کی طرف سے برے ہی برے خیالات بتا کے دل میں گزرتے تھے، اس کو ساری عمر کبھی پکھری جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ بس پکھری کے نام سے اس کا دم فنا ہوتا تھا۔ اور حاضر اور ناظر دونوں کو خصوصاً ناظر کو پکھری ایسی تھی جیسے مچھلی کو تالاب، مویشی کو تھان پرند کو گھونسلہ، عورت کو میکہ، باوجودیکہ سرتا سر تصور غیرت نیگم کا تھا، مگر بتا التا چور کی طرح سہا جاتا تھا کہ دیکھئے یہ بھائی بہن کئی کئی دن سے کمیٹیاں کر رہے ہیں۔ کیا فساد کھڑا کرتے ہیں۔ اس کے دوست آشناؤں میں بھی کسی نے اس کو کو تو اہی اور فوجداری میں استغاثہ کرنے کی صلاح دی تھی، مگر یہ چند اس کو مردو بنا تے تھے، پکھری کا نام آیا اور اس کا رنگ فق ہوا۔ وہ بگڑ بگڑ کر ایک ایک منٹ کرتا تھا کہ یارو مجھ سے مدعی بننے کی توقع مت کرو۔ کوئی ایسی تدبیر بتاؤ کہ اگر یہ لوگ مجھ پر نالش کریں۔ اور کریں گے ہی، تو مجھ کو حاکم کے روبرو نہ جانا پڑے، بہتیرا لوگ سمجھاتے تھے کہ ان کی طرف سے نالش کے ہونے کی کوئی رواداد نہیں، اور فرض کیا نالش ہو بھی تو تم اپنی طرف سے جواب دہی کے لیے مختار وکیل کھڑا کر دینا، بلکہ بعض شرط باندھتے تھے کہ اگر نالش ہو اور خدا نخواستہ تم پر کسی طرح کی آنچ آجائے تو حاکم جو سزا تمہاری تجویز کرے اس کی چوٹی ہم بھگتے کو موجود ہیں چاہو ہم سے لکھواؤ۔ بتا کہتا تھا تم ناظر بھائی کے ہتھکنڈوں سے واقف نہیں ہو۔ ارے میاں، وہ اس بلا کا آدمی ہے۔ کہ چچا باوا بے چارے کسی لینے میں نہیں دینے میں نہیں۔ اس نے دل پر رکھا تو شہر سے نکلوا کر چھوڑا۔ بتا کا حال یہ ہو گیا تھا کہ ہریالی اور اس کی بڑھیا کی مرہم پٹی کی ضرورت سے کھڑے کھڑے گھر میں جاتا تو اٹلے پاؤں باہر بھاگا ہوا آتا دیکھو کہیں سرکار سے طلبی تو نہیں آئی۔

اتنے دن نہ تو اس نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا اور نہ پوری نیند سویا، اگر تھوڑے دن اور سید حاضر کی طرف سے سببت نہ ہو تو بتا اس قدر پریشان تھا کہ وہ ابتدا کرتا اور اتنے دن بھی وہ اپنے آپ کو لیے رہا۔ تو ان لوگوں کی نارضا مندی کے خیال سے اس کو جرات نہیں ہوئی، سید حاضر کو دور سے آتا ہوا دیکھ کر کھڑا ہو گیا، مگر اس وقت تک اس کے دل میں کھٹکا تھا کہ ان کا آنا خالی از علت نہیں۔ جب سید حاضر نے قریب پہنچ کر معانفہ کے لیے ہاتھ پھیلائے تو اس کو اطمینان ہوا اور بھائی کے گلے لگ کر غیرت نیگم کی زیادتی اور اپنی مجبوری اور اتنے دن پریشانی کو یاد کر کے خوب رویا۔ سید حاضر کا جی بھر آیا۔ کہ دیکھو گھر میں خدا کے فضل سے سب طرح کی فراغت ہے ایک چھوڑ دو دو پیچیاں ہیں۔ بچے ہیں کسی بات کی کمی نہیں مگر ایک بری لت جو اپنے پیچھے لگالی ہے، تو زندگی کی تلخی سے گزرتی ہے، معانفہ کے بعد دونوں بھائی ایک جگہ بیٹھے تو سید حاضر نے کہا۔ بتا بھائی یہ نیا رشتہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے کہ وہ پرانا رشتہ بھی اس کے پیچھے کیا گزرا ہوا۔ دیہات کا کم بخت کیا برا

دستور بنے کہ ہم تو بہن کے گھر پر باا ضرورت آ نہیں سکتے۔ اب تمہاری ہی طرف سے ملاقات ہو تو ہو۔ سید مگر تو بھلا تم کیوں آنے لگے شہر میں بھی تم کہیں نظر نہیں آتے آج آنھویں دن بنے میں بلاناغہ دونوں وقت یہاں آتا ہوں۔ تم کو دو چار بار دیکھا بھی، مگر تمہارا رخ نہ پایا۔ آخر آج مجھ سے رہا نہ گیا۔ تو میں نے کہا لاؤ میں ہی پیش قدمی کر کے تم سے ملوں، بتایا کیا کہوں میں ندامت کی وجہ سے نہیں مل سکا۔ ”ندامت کیا بات بنے! عورتیں ناقصات العقول آپس میں لڑا جھگڑا ہی کرتی ہیں۔ اگر مرد ایسی ایسی باتوں کا خیال کیا کریں تو دنیا میں کیسے گزرے۔

بتایا: آپ پر ثابت تو ہو گیا ہو گا کہ زیادتی کس کی تھی۔

حاضر: اس معاملے میں میرا منہ نہ کھلاؤ۔ میں تم سے کیسی ہی سچی بات کیوں نہ کہوں پر تم یہی سمجھو گے کہ بہن کی طرف داری کرتا بنے۔

بتایا: میں نے آپ کی تدن کی تعریف اور کسی سے بھی نہیں چچا باوا سے سنی بنے میں آپ کی نسبت بے انصافی کا خیال کبھی کر ہی نہیں سکتا۔

حاضر: دوسرا نکاح تو تم کر ہی چکے۔ اب اس کی نسبت یہ کہنا کہ تم نے جلدی کی یا بے جا کیا فضول بنے، مناسب کیا، خوب کیا۔ اور ضرور کرنا چاہیے تھا۔ تمہارا طرز زندگی دین کے شرافت کے بھلمنا ہٹ کے عقل کے سب کے خلاف تھا۔ بڑی خوشی کی بات بنے کہ تم نے اس سے توبہ کی خدا کرے کہ تمہاری یہ توبہ پہاڑ کی طرح مستحکم ہو، بھاری بھر کم ہو، مضبوط ہو، اٹل ہو مگر مجھ کو اس بات کا اندیشہ بنے کہ ایک مگر کو تم اٹھانہ سکے، جوڑی تم سے کیونکر ملائی جائے گی۔ تمہاری وہی مثل بنے کہ تنور سے بچنے کے لیے بھاڑ میں گرے دو بیبیوں کا رکھنا۔ جمع بین التفحصین کچھ آسان کام نہیں، تم نے ایسی ہنڈیا پکائی بنے کہ یہ واقعہ جو پیش آیا۔ اس کا پہلا ابال بنے۔ جب کھرچن کی نوبت آئے گی تو اصل مزد معلوم ہو جائے گا۔ یقین جانو کہ میں کچھ بہن کی پاسداری سے نہیں کہتا۔ بلکہ حقیقت نفس الامری بیان کرتا ہوں کہ تم نے غیرت کی قدر و وقعت کو مطابق نہیں پہچانا۔ غیرت بیگم خدا نخواستہ (برامت ماننا) تمہاری اس بی بی کی طرح گری پڑی بازاری عورت نہیں۔ وہ ایسے جیتھے اور ایسے گروہ اور ایسی برادری اور ایسے خاندان کی بیٹی بنے کہ جہاں اس کا پسینہ گرے، آج سید مگر میں کم سے کم دو سو آدمی نکلیں گے، جو اپنا خون بہانے کو موجود ہو جائیں گے۔ عورتوں کے معاملے عزت اور آبرو اور ناموس کے معاملے میں مال کی تو کیا حقیقت بنے، عزت کے آگے شرفا خاص کردیہات کے خاص کرسادات خاص کرسادات سید مگر جان کی ذرا بھی پروا نہیں کرتے یا دکر تو کتنی منت کس قدر خوشامد کیسی آرزو سے ماموں اور ممانی (خدا ان دونوں کو جنت نصیب کرے) غیرت بیگم کو بیاہ کر لائے آج کو دو دونوں یا ان میں سے ایک بھی زندہ ہوتے تو کیا تمہاری مجال تھی کہ تم غیرت بیگم پر سو کن لاؤ اور

اس کی گود میں بٹھاؤ۔ پھر بند خدا تم کو اتنا بھی خیال نہ آیا کہ ماں باپ اس کے نہیں۔ ساس سرے اس کے نہیں؛ دنیا میں وارث کو بوسر پرست کہو ایک تم سو تم نے جلا جلا کر اس کا یہ حال تو کر دیا کہ سید نگر کی نسبت ایک تہائی بھی باقی نہیں رہی۔ اور اس پر بھی تم کو صبر نہ آیا۔ سو کن کو لا، بٹھایا، عورت ہو تو جانو، عقل ہو تو پہچانو کہ سو کن کا کیسا داغ ہوتا ہے۔ بیوگی سے بڑھ کر میاں نکٹھو پا جج ہو یا بد مزاج ہو۔ روٹی کھانے کو اولاد جی بہا نے کو نہ ہو سب مصیبتیں جھیلی جاسکتی ہیں اور نہیں جھیلی جاسکتی تو سو کن کی دنیا کے جلا پے اور جلا پے ہیں۔ اور سو کن کا جلا پا ساگپا۔ جس شخص پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو۔ وہ اگر ایفون کھا لیتی یا کنوئیں میں گر پڑتی یا بیٹ میں چھری بھونک لیتی۔ اس سے کسی بات کا تعجب نہ تھا بلکہ تعجب یہ ہے کہ رونے پیٹنے پر قناعت کی۔ اگر خدا نخواستہ اس نے اپنے آپ کو ہلاک کر لیا ہوتا تو تمہارا کیا جاتا، تم تو نئی بی بی کے ساتھ چین کرتے۔ گل چھرے اڑاتے، ہم کو بہن کہاں پیدا تھی۔

بتا: اگر آپ کہیں تو میں اس عورت کو چھوڑ دوں

حاضر: میں تو چھوڑنے کو نہیں کہہ سکتا۔ اور تم ایسے چھوڑنے والے ہوتے تو کرتے ہی کیوں۔ فرض کیا کہ تم نے میرے کہنے پر اس کو چھوڑ دیا اور پھر وہی سابق کا وطیرہ اختیار کیا تو اپنے ساتھ دنیا اور دین دونوں جگہ میرا منہ بھی کالا کراؤ۔ بتا: پھر آپ ہی کوئی راؤ نکالے۔ مجھ سے ایک نادانی تو ہوئی اور اپنی طبیعت کو بار بار آزمایا چکا ہوں، میرے قابو کی نہیں آج آپ سے وعدہ کروں اور کل کو جھوٹا ٹھیسروں۔ تو پھر آپ کے نزدیک میرا کیا اعتبار رہا۔ اس سے بات کا صاف صاف کہہ دینا اچھا اور اگر چاہے آپ سے اس معاملے میں صلاح پوچھنا داخل بے حیائی ہے مگر چچا باوا چلتے چلتے کہہ گئے تھے کہ اگر کوئی مشکل آپ پر آئے تو آپ کی رائے پر عمل کرنا اور یوں بھی آپ بڑے بھائی ہیں۔ باپ کی جگہ آپ ہی اگر اڑی پر آڑے نہ آئیں گے، تو میں کس کے پاس التجا لے جاؤں۔ بندے کے سو قصور خدا معاف کرتا، آپ برائے خدا میرا ایک قصور معاف کیجئے۔

حاضر: بات یہ ہے کہ میں تمہاری اس نئی بی بی کے حالات سے بخوبی واقف نہیں، میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کس طرح اس کے ساتھ مدارت کرنی مناسب ہے۔

بتا: اس کم بخت کے اور حالات ہی کیا ہیں۔ بازاری عورت ہے تن تنہا ت سے تو بہ تو بہ پکار رہی تھی، میری جو شامت آئی۔ اس کے ساتھ عقد شرعی کر لیا۔ کیونکہ چچا باوا کے سامنے آوارگی سے میں تو بہ کر چکا تھا۔ حماقت پر حماقت یہ ہوئی کہ اب میں اس گھڑی کو بہت پچھتا رہا ہوں کہ گھر میں لا کر اوپر کا کام کاج سپرد کیا۔ دوسری ماماؤں کی طرح رہنے سہنے لگی، اگ میں نے اس کے ساتھ کسی طرح کا سروکار رکھا ہو تو مجھ پر خدا کی مار پڑے، یہ تو اس کی بچھلی کیفیت ہے، آئندہ کے لیے بھی

اگر آپ کی مرضی ہو تو وہی ماماؤں کی طرح رہنے گی اور بدستور گھر کی خدمت کرے گی۔

حاضر: اس کا غیرت نیگم کے پیش نظر رہنا تو میں پسند نہیں کرتا۔ کیونکہ اس صورت میں فساد عا جل کا بڑا اندیشہ ہے دو سو کنوں کی مثال میں تمہیں کس طرح بتاؤ یوں تبھو کہ دو گا اس ہیں ایک میں سو ڈا بنے پانی میں حل کیا ہوا۔ اور دوسرے میں ایسڈ ممکن ہے کہ سو ڈا اور ایسڈ ملیں اور ان میں جوش و خروش پیدا نہ ہو پس دونوں کو ایک جگہ رکھنے کا تو تم کبھی بھول کر ارادہ نہ کرنا۔ ورنہ آج دو ہتر تھے تو کل جو تیاں ہوں گی اور پرسوں چھریاں اس کو تو کسی دوسرے شہر میں یا خیر دوسرے محلے میں یا خیر دوسرے گھر میں تو رکھنا ضرور ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ تم کہتے ہو کہ وہ اکیلی ہے۔ تن تنہا۔ آدمی زیادہ رکھے جائیں تو تمہاری چادر میں اتنے پاؤں پھیلائے کی گنجائش نہیں۔ پس صرف یہ ایک تدبیر ہے کہ زنا نے مکان میں پورب کی طرف جو ایک کھانچا سا نکل گیا ہے۔ پردے کی طرف دیوار کھچو او اور ڈیوڑھی میں سے دروازہ پھوڑ کر اتنا گھرا لگ کر او۔ اور حقیقت میں یہ تھا بھی دوسرا گھر ماموں باوا نے مول لے کر باہر لگی کا دروازہ تینہ کر کے زنا نے مکان میں ملا لیا تھا۔ تیغے کا نشان اب تک موجود ہے اتنا مکان ایک مختصر خانہ داری کے لیے بخوبی کافی ہے۔ ضرورت کی سب چیزیں موجود ہیں۔ والا ان در والا ان آگے سانا بن۔ دونوں طرف بڑی بڑی دو کوٹھڑیاں۔ باورچی خانہ اس کے بغل میں چیز بست رکھنے کو لمبی کو لکی سامنے کے ضلع میں سر درہ بس اور چاہیے کیا۔ بڑے گھر کی طرف خدا کے فضل سے آدمی زیادہ ہیں اور خرچ بھی بہت ہے۔ برابری اگر چاہو تو دونوں گھروں میں مکان نہیں۔ اور ضرور بھی نہیں اور مناسب بھی نہیں۔ چھوٹے ماموں باوا پینسٹھ روپے کی تنخواہیں اور کرایہ تمہارے نام کرا گئے ہیں۔ اور ساٹھ کی غیرت نیگم کے نام سواپنے پینسٹھ میں تیس روپے چھوٹی بی بی کو دیا کرو۔ اکیلا دم ہے۔ فراغت سے بسر کر سکتی ہیں۔ پینتیس تم کو بچیں گے۔ اس میں تمہارا کپڑا ہے اور باہر مردانے کا خرچ، غیرت نیگم کے ساٹھ کو ہاتھ مت لگاؤ۔ ایک دن بڑے گھر میں رہو ایک دن چھوٹے گھر میں نہ بڑھو نہ کھڑکھڑ اللہ اللہ خیر صلا۔

بتاؤ اپنی جگہ پہ ڈر رہا تھا کہ نہیں معلوم شہر سے نکلوانیں گے یا قید ڈالوانیں گے یا گھر بار ضبط کرانیں گے۔ سید حاضر کا فیصلہ سننے کے ساتھ اس کے پیروں پر گر پڑا۔ کہ بس اس میں اگر میری طرف سے کبھی سر مو فرق ہو تو جانیے گا کہ میری اصالت میں فرق ہے۔

ہریالی بھی اپنی جگہ بہت خوش ہوئی۔ اور سمجھی کہ اب میرا بی بی ہونا سب پنپوں نے جانا، گھر بنوا پایا، میاں کے پینتیس بھی میرے اپنے ہی ہیں۔ وہ ملا کر تنخواہوں میں کرائے میں بڑا آدھا میری طرف رہا۔ کہاں غیرت نیگم سیدانی اشراف میاں کی چھو بھی زاد بہن صاحب والا دآٹھ نو برس کی بیابھی ہوئی اور کہاں میں انصاف کی رو سے تو میں ان کی جوتی کی برابری



نہیں کر سکتی۔ قربان جاؤں خدا پہ کہ اس نے مجھ گنہگار نا چیز کی توبہ کو ایسا نوازا کہ ان ہی کے سنگے بھائی کے ہاتھ سے مجھ کو جتوایا۔ غیرت نیگم کو تو سوکن کے نام کی جلن تھی۔ اس کو مکان سے تنخواہ سے کچھ بحث نہ تھی۔ ہریالی کو کیسے ہی برے احوال سے رکھتے۔ مگر جب تک غیرت نیگم یہ جانتی تھی کہ یہ میری سوکن ہے۔ کسی طرح وہ راضی ہو ہی نہیں سکتی تھی، لیکن بڑے بھائی نے جب ایک فیصلہ کر دیا۔ تو کیا کرتی دل میں پیچ و تاب کھا کر چکی ہو رہی۔ بتانا کے ساتھ بولنا۔ بات کرنا پہلے سے کم تھا، اب بالکل چھوڑ دیا۔ غرض صحن میں پردے کی دیوار اٹھائی گئی ڈیوڑھی میں دروازہ لگا۔ ہریالی نے الگ گھر کر کے رہنا شروع کیا۔

## دوسو کنوں کی لڑائی کا سلسلہ اور اس کا اثر بدبتا پر

### بتا کی اولاد پر اس کی بیسیوں پر انتظام خانہ داری پر

آدمی الگ گھر کرتا ہے تو پلنگ بیڑھی تخت چوکی چولہا چکی برتن بھانڈا سبھی چیزیں اس کو درکار ہوتی ہیں۔ غیرت بیگم کے یہاں اسباب کے اٹم لگے ہوئے تھے۔ مگر کس کی مجال تھی کہ تنکا تو اٹھا کر ادھر سے ادھر لے جائے۔ ہریالی کو ابتدا میں سخت تکلیف ہوئی۔ مگر سلیقہ بھی عجیب چیز ہے۔ دو ہی برس میں ہریالی نے رفتہ رفتہ اپنا گھر ایسا درست کر لیا کہ غیرت بیگم کے کئی پشتوں کے جیسے ہوئے گھر میں ایک چیز وقت پر نہیں بھی ملتی تھی، مگر ہریالی کے یہاں آتا تو کون تھا لیکن اگر دس مہمان بھی آجاتے تو آسائش کا ہمہ سامان موجود پاتے، ایک مرتبہ پرانا سرکہ درکار تھا تعجب کی بات ہے کہ سارے محلے میں کسی کے یہاں سے نہ ملا، ہریالی نے (جس کی طرف کسی کا ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا تھا) سننے کے ساتھ ہی پیالہ بھر کر بھجوا دیا۔ جس طرح سید حاضر نے ٹھیرا دیا تھا۔ بتا ایک ایک دن باری باری سے دونوں گھروں میں رہتا تھا۔ بڑے میں تو کوئی اس سے بولتا چلتا نہیں تھا۔ کسی دن اگر معصوم کو پکڑ پایا تو گھڑی دو گھڑی اس کے ساتھ جی بہایا ورنہ منہ لپیٹا سو رہا خاطر داری سمجھو، مدارت سمجھو، آؤ بھگت سمجھو۔ جو کچھ تھی سو چھوٹے گھر میں تھی۔ مگر غیرت بیگم اس کو وہاں بھی چین سے نہیں رہنے دیتی تھی وہ اپنے گھر میں تو بتا سے ایسی بے رخی کرتی کہ گویا اس کو میاں کی ذرا بھی پروا نہیں۔ اور چھوٹے گھر کی باری آئی اور صبح سے اس نے بتا کی نگرانی شروع کی۔ مردانے میں کتنی دیر بیٹھے گھر میں کس وقت آئے، کہاں سوئے۔ کیا کھایا اور کتنا کھایا۔ ہریالی کے ساتھ کیا باتیں کیں۔ گھر کے نوکروں پر ایک نیا کام یہ اور آ پڑا کہ سارے سارے دن اور پہر پہر رات گئے تک ایک ڈیوڑھی میں کھڑی جھانک رہی ہے۔ تو ایک دروازے میں کان لگائے سن رہی ہے۔ اور ایک ہے کہ جس طرح جوا با تانا بانا مٹتا پھرتا ہے۔ اوپر تلے بیسیوں پھیرے زمانے سے مردانے میں اور مردانے سے زنانے میں۔ باوجودیکہ غیرت بیگم نے ایک بتا کے پیچھے اتنے جاسوس لگا رکھے تھے اس پر بھی اس کا جی نہیں مانتا تھا۔ ایک موکھا تو اس نے پاخانے کی دیوار میں کیا کہ چھوٹے گھر کے سردرے کی ذرا ذرا بات وہاں سے سنائی دیتی تھی۔ رد گیا ایک ضلع صحن سایہ بان اور سایہ بان کے اندر کا دالاں سو غیرت بیگم کی طرف ایک بالا خانہ تھا۔ اور اس میں تھی ایک کھڑکی کھول دو تو صحن سے لے کر اندر والے دالاں تک سب کچھ دکھائی دیتا تھا۔ یا تو غیرت بیگم نے جس دن کی بیایا آئی کبھی بالا خانے پر پاؤں نہیں رکھا تھا یا اب سو کن کی ضد پر جس دن چھوٹے گھر کی باری ہوتی صبح سویرے سے کوٹھے پر چڑھی چڑھی اگلی صبح کو اترتی۔ غرض ساری

گرمی غیرت بیگم نے میاں کو ہریالی سے بات نہیں کرنے دی، جاڑ آیا اور پردے چھوڑ کر دالان میں سونے لگے تب تھک کر بیٹھی شروع میں تو نوکروں کو آنے جانے کی ایسی سخت ممانعت تھی کہ ایک مرتبہ ایک لونڈی نے باہر ڈیوڑھی میں سے آگ پکڑا دی تھی۔ غیرت بیگم کو خبر ہو گئی تو اس کے ہاتھ پر جلتا ہوا انگارہ رکھ دیا لیکن پھر سوچی کہ نوکروں سے خبریں خوب ملتی ہیں ان کا روکنا ٹھیک نہیں۔ بندی کھول دی مگر اس سے خرابی کیا پیدا ہوئی کہ ماما لونڈی جو کوئی چھوٹے گھر سے ہو کر آتی۔ غیرت بیگم اس سے حال پوچھتی، اگر وہ اس کی خواہش کے مطابق کچھ بیان نہ کرتی تو اس پر خفا ہوتی کہ تو جھوٹی ہے یا چھپاتی ہے۔ یا تو ادھر ملی ہوئی ہے، ناچار اس کی بدگمانیوں سے بچنے کے لیے نوکروں نے اپنے جی سے باتیں بنانا شروع کیں۔ حقیقت میں تو وہ باتیں ہوتی تھیں بے اصل مگر اس کو ایک بات کا ہفتوں جھگڑا لگا رہتا تھا، آپ رنجیدہ رہتی اور بتلا پر اپنی بد نفسی اور حماقت ثابت کرتی۔ ایک آتی اور دل سے جوڑ کر کہتی بیوی آت تو تمہاری سوکن کے عجب ٹھاٹھ ہیں۔ ایسی بن سنور کر بیٹھی بن جیسے کوئی نئی دہن سر میں چنبیلی کا تیل پڑا ہو۔ مگر کوئی چار روپے سیر کا۔ مارا گھر پڑا مہک رہا ہے۔ چوٹی گندھی ہے یہ بڑے بڑے موتیا کے پھولوں کا سارا گہنا البتہ ڈیڑھ روپے سے کیا کم کا ہوگا۔ ملاگیری چنا ہوا مہینن ریگ کا دوپٹہ اچھا خاصا چار انگل کا جوڑا سنہری ٹھیکا ٹھیکا ہوا سفید ترین تیل نیل کا پا جامہ پانچوں میں نیل دار کنارہ۔ کنارے پر کیکڑی۔ کیکڑی پر بانکڑی۔ بانکڑی پر بانکڑی کی چپک۔

غیرت بیگم یہ سن کر ایک ٹھنڈا سانس بھر کر کہتی ہاں صاحب جن کے بھاگ ان کے سہاگ دوسری نے یہ بات بنائی کہ وہ آپ تو صحن میں کرسی بچھائے بیٹھی ہیں، میاں سامنے کھڑے گنا چھیل رہے ہیں۔ گندیریاں بنا بنا کر آپ بھی کھاتے جاتے ہیں اور اپنے ہاتھ سے ان کے منہ میں بھی دیتے جاتے ہیں، میں تو یہ دیکھ کر لٹے پاؤں پٹ آئی، ماما باہر بیٹھی کھانا پکا رہی ہے۔ غیرت بیگم عنت خدا کی پھٹے منہ حیا اور شرم تو مطلق چھو کر نہیں گئی۔ تیسری اشارے سے بیوی کو باقی کہ ذرا آپ بھی تو موکھے میں دیکھئے آج میاں کا جی کیسا ہے۔ دولائی اوڑھے پڑے ہیں اور کچنی پاس بیٹھی پاؤں دبا رہی ہے۔ غیرت بیگم اری کم بخت جھک کر دھوکہ ہوا ہوگا۔ کچنی لیٹی ہوگی اور میاں پاؤں دبا رہے ہوں گے۔

اس طرح کی سینکڑوں باتیں صبح سے شام تک اپنے ہی گھر کے نوکر غیرت بیگم سے آ کر کہتے۔ اور سب میں زیادہ منہ لگی وہ تھی جو اس طرح کی باتیں خوب تصنیف کر سکتی تھی۔ اتنی تو کسی کی مجال نہ تھی کہ غیرت بیگم کے منہ پر ہریالی کو ہریالی کبر دے اور اگر کسی کی زبان سے بھولے سے بھی جھوٹی بی بی نکل جاتا تو بیشک غیرت بیگم تڑ سے اس کے منہ پر جوتی کھینچ مارتی۔ نام سے تو اتنی انزرت اور پھر رات دن اس کی تسبیح آ خر سوچ کر غیرت بیگم نے سوکن کو بے غیرت کا خطاب دیا۔ اور جتنے لوگ غیرت بیگم کے طرفدار تھے یہاں تک کہ ادنیٰ ادنیٰ نوکر اس کی حمایت پا کر سب بے تامل ہریالی کو پکار پکار کر بے

غیرت کہتے تھے اور دیوار کے پیچھے ہریالی اپنے کانوں سے سنتی تھی بلکہ اس نے سینکڑوں بار بتایا کہ منوادیاتھا۔ بتایا کہ نوکروں کے منہ سے یہ لفظ سن کر سخت رنج ہوتا تھا۔ کیونکہ ہریالی جو کچھ تھی سو تھی۔ مگر رجب کے گھر آتی اور رانی کہلاتی، اب تو اس کی منکوحہ تھی نوکروں کو اور گھر کی اونڈیوں کو کیا زبیا تھا کہ اس کی منکوحہ کو یوں منہ بھر بھر گالیاں دیں۔ مگر وہ کیا کر سکتا تھا۔ ہریالی کو سمجھا دیتا کہ کچھ تم سے پر خاش نہیں، مجھ کو نوکروں کے ہاتھ سے ذلیل کرانا مقصود ہے، خدا کی شان میرے نوکر میرے اونڈی غلام اور ایسے گستاخ ایسے بے ادب، کیا کروں کچھ کرتے بن نہیں پڑتا۔ میں صبر کرتا ہوں تم بھی صبر کرو۔ غیرت بیگم کو سوکن کی طرف سے ہر طرح کی بدگمانی تو تھی۔ بتول کو تو اس طرف کوئی لے جانے نہیں پاتا تھا۔ مگر معصوم اپنے پاؤں دوڑا دوڑا پھرتا تھا۔ اس کو کون روکے، غیرت بیگم بہتیرا ڈراتی دھمکاتی گھر کتنی مگر یہ کس کی سنتا تھا۔ آنکھ پکی اور گھر میں۔ غیرت بیگم سے اور بتلا سے تو روز بروز عداوت بڑھتی چلی جاتی تھی، بتلا کے جانے اور چھیڑنے اور ایذا دینے کو جہاں غیرت بیگم اور بہتیری باتیں کرتی تھی ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ بچوں کے ساتھ اس کی اگلی سی مدارات باقی نہیں رہی تھی۔ اب تو وہ بات بات پر معصوم کو مار بیٹھتی اور کوسنا تو تکیہ کا ام ہو گیا تھا۔ بچوں کا تو قاعدہ ہے کہ وحشی جانوروں کی طرح بلانے اور پرچانے سے رام ہوتا ہے۔ معصوم کا یہ حال ہو گیا تھا کہ غیرت بیگم کی شکل سے دور بھاگتا۔ اور اس کی پرچھنائیں سے ڈرتا چھوٹے گھر میں اس کی ایسی خاطر داری ہوتی تھی کہ اس نے اندر پاؤں رکھا اور ہریالی نے دوڑ کر اس کو گود میں لیا۔ ہاتھ منہ دھلایا۔ بالوں میں تیل ڈالا۔ کنگھی کی آنکھوں میں سرمہ لگایا۔ میوہ منٹھائی اس کے لیے لگا رکھتی تھی۔ جو کچھ موجود ہوا کھلایا۔ گھنڈی تکرے اگر ٹوٹ گیا ہے ٹانگ دیا۔ کبھی کبھار کوئی کھلوتا منگوا دیا۔ آپ پان کھاتی ہوئی۔ تو اس کو بھی مکترا بنادیا۔ یا آئینہ ہاتھ میں دے دیا کہ دیکھو تو کیا منہ الال ہوا ہے۔ پس معصوم سارے سارے دن چھوٹے گھر کھیلتا اور اگر کوئی بڑے گھر میں بلا لے تو روتا اور مچلتا۔ ایک دن غیرت بیگم معصوم کا انگر کھا قطع کر رہی تھی کہ اونڈی سے کہا کہ جا ذرا معصوم کو جلدی بلا لائے۔ انگر کھا اس کے قد سے ناپ لوں اور ایسا نہ ہوا اونچا ہو جائے، اونڈی نے چھوٹے گھر میں جا کر کہا چلو میاں بی بی باقی ہیں۔ اونڈی کی صورت دیکھ کر اور بلی سن کر معصوم زمین میں لیٹ گیا، بہتیرا اونڈی گود میں اٹھاتی ہے۔ نکل نکل پڑتا ہے۔ اس کشتم کشتاں میں تھوڑی دیر لگ گئی اور وہاں غیرت بیگم ہاتھ میں کپڑا لیے انتظار کر رہی ہیں۔ آخر دوسری کو دوڑا یا کہ نسبتی معصوم کو بلا نے گئی تھی وہیں مگر رو گئی۔ بس آپ بھی اس کے ساتھ کھیل میں لگ گئی۔ جادوؤں کو پکڑ کے تو

۱۱

غیرت بیگم جو بگڑی اور خفا ہو کر زور سے بولی تو اپنے گھر میں ہریالی نے بھی سنا۔ اور اس نے جلدی سے اٹھ کر معصوم سے کہا۔ آبا بڑی اماں کے یہاں کیسے کیسے بہار کے کپڑے ہیں، جلدی بھاگ کر جاؤ تم بہاری بھی اچکن بیونتی جائے۔ وہ بڑی

اماں نیٹھی کبر رہی ہیں۔ آنکھیں میچیں کون آئے۔ معصوم سامنے گیا تو غیرت نیگم بولی موئے جان باریوں ہی سارے دن خدائے خوار خاک چھانا پڑا۔ پھر دیکھ اب تجھ کو کیسے ظالم استاد کے پاس پڑھنے بٹھاتی ہوں کہ تو بھی یاد کرے۔ معصوم: میں اپنی چھوٹی اماں کے پاس بھاگ جاؤں گا۔

غیرت نیگم: اماں دست پنے میں ایک انگارا کہ اس کم بخت ناشدنی کا منہ جاؤں گھوڑا بدوں کا بد۔ گندی بوٹی کا بساندا شور با آخراپنی اصالت پر آگیا۔ کتنی کومیا بنایا میرے سامنے اگر پھر اس مردار کو اماں کہا ہو گا تو جیو پکڑ کر کاٹ ڈالوں گی، معصوم یہ سن کر آدھی دور سے پھر الٹا بھاگ گیا۔ نسبتی پیچھے دوڑی بھی مگر اب وہ کسی کے ہاتھ آتا تھا۔ ڈیوڑھی میں کھڑا ہوا، غیرت نیگم کے چڑانے کو پکار پکار کر چھوٹی اماں چھوٹی اماں کہنے لگا۔ غیرت نیگم نے داان میں سے بیٹھے بیٹھے جوتی کھینچ کر ماری مگر وہ ڈیوڑھی تک کیا پہنچتی، غرض معصوم کو جو دھت لگی تو غیرت نیگم کو اس طرح گھڑی بھر تک دق کرتا رہا اور پھر چھوٹے گھر میں جا گھسا۔ غیرت نیگم ہریالی کی ساری باتوں کو برائی پر ڈھال لے جاتی تھی۔ معصوم کے ساتھ جو ہریالی عام ماؤں سے اور خصوصاً غیرت نیگم سے بڑھ کر محبت کرتی تھی تو میاں کی خوشامد پر محمول کرنا شاید چنداں بے جا نہ تھا مگر ہریالی کی مخالفت میں غیرت نیگم کے خیالات ایسے بڑھے ہوئے تھے کہ اس کا بھی دوسرا ہی مطلب لگاتی تھی اس کا مقولہ یہ تھا: دیکھنا مراد کتنی کو کیسی معصوم کی لپو پتو میں لگی رہتی ہے۔ اور مجھ کو یقین ہے کہ وہ ضرور اس کو مجھ سے تزا کر رہے گی ابھی سے اس کو میری صورت سے بیزا کر دیا ہے۔ نہیں تو اتنے بچے ماؤں سے ایک لمحے کے لیے پرے نہیں ہٹتے۔ اور معصوم کو تو اگر میں نہ بلاؤں کبھی بھول کر بھی ادھر کا رخ نہ کرے۔ نیگم کو اٹے سیدھے ہر طرح ہریالی کو انا بنادینا منظور تھا معصوم اگر کبھی بیمار ہوتا اور چھوٹے بچے اکثر بیمار ہوتے ہی رہتے ہیں۔ تو مصیبت یہ تھی کہ میاں کی ضد کے مارے دوا خانہ کچھ نہ کرتی اور جو کوئی دکھ ہو تو خانہ کروں اس کو تو دشمنوں نے کچھ کر دیا ہے۔

اور دشمن کون یہی بھلی گھوسا یہ کیا میں کسی کو جیتا چھوڑے گی لیکن اگر میرے بچے کا بال بیکا ہوا تو کوٹھڑی میں کیا ماری تھی اگر جان سے نہ مار ڈالوں تو سید جی جی نہیں۔ اور پھر اس کے حمایتیوں کو دیکھ لوں گی۔ ہریالی عجب پس و پیش میں تھی۔ اگر معصوم کو نہیں آنے دیتی تو کہیں خود جو بے اولاد ہی ہے جلتی ہے دیکھ نہیں سکتی اور آنے دیتی ہوں تو اس کی ذمہ داری کون کرے کہ بچہ بیمار نہ پڑے تو ضرور اچھا ہی ہو جایا کرے پس ذرا بھی معصوم کا جی ماندہ ہوتا تو ہریالی کا کئی چلو بو خشک ہو جاتا کہ خدا کرے انتظام خانہ داری کی یہ صورت ہوتی کہ آخرا اس کو بھی تو صاحب خانہ کی توجہ درکار ہے۔ یہاں آپس کی کبا سنی تاک جھانک لڑائی جھگڑے قصے قضیئے سے اتنی فرصت ہی کس کو تھی کہ انتظام کی طرف متوجہ ہوتا اور فرصت تھی بھی تو دلوں میں شوق نہیں۔ رغبت نہیں اطمینان نہیں امنگ نہیں۔ کسی کی بلا کو غرض پڑی تھی کہ یہ در دسر مول لے خانہ داری میں سب

سے بڑا انتظام کھانے کا کہ صبح بھی ہو اور شام بھی ہو۔ سو کھانے کا یہ حال کہ بڑے گھر میں تو بتانا نہ کبھی پیٹ بھر کر کھانا کھایا ہی نہیں۔ میاں بی بی میں ناخوشی تو سدا کی تھی، تاہم کھانا دونوں ایک ہی دسترخوان پر کھایا کرتے تھے جس دن سے ہریالی نے الگ گھر کیا، غیرت بیگم نے میاں کے ساتھ بات چیت کرنی کیا چھوڑی بات چیت کے ساتھ کھانا اور کھانے کے ساتھ دیکھنا بھاننا نکالنا سب کچھ چھوڑ دیا۔ دو چار بار بتانا نہ منہ پھوڑ کر کہا بھی جواب نہ ارد۔ پس کھانا تیار ہوتا تو گھر کے نوکروں میں سے کسی نے میاں کا حصہ نکال کر لا آگے رکھ دیا۔ اس بے قراری کے ساتھ جو کھانا دیا جاتا تھا تو بتانا کو اس قدر طیش آتا تھا کہ اگر اس کا بس چلے تو غیرت بیگم کو کچی اٹھا کر کھا جائے مگر وہ اپنا خون جگر پی کر چپ ہو رہتا تھا۔ ڈر کے مارے ذرا کی ذرا منہ جھٹلایا اور کھڑا ہو گیا۔ غیرت بیگم خود تو کبھی خبر نہیں لیتی تھی۔ اگر کبھی کوئی نوکر خدا کے واسطے کو کہہ بیٹھا کہ میاں تو پوری ایک چپاتی بھی نہیں کھاتے تو بولتی اس مال زادی کے بدون میاں کے حلق سے نوالہ کیوں اترنے لگا اور ان کو گھر کا کھانا کیوں بھانے لگا۔ غیرت بیگم جلی تن کا بتانا سے بدتر حال تھا وہ آپ ہی اپنے دل سے باتیں پیدا کرتی اور آپ ہی ان کی ادھیڑ بن میں دو دو وقت کھانا نہ کھاتی۔ نوکروں نے جو دیکھا گھر والے دو میاں اور بیوی اور دونوں کو کھانے کی طرف مطلق رغبت نہیں۔ یہ لوگ بھی سستی اور بے پرواہی اور چوری اور طرح طرح کی خرابیاں کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خرچ تو ڈیوڑھا اور دونا بڑھ گیا۔ اور برکت آدھی اور پاؤ بھی باقی نہ رہی، غیرت بیگم کی طرف تو سویرے خاک اڑنے لگی جھوٹا گھر خیر یوں ہی لاشم پاشم چلا جاتا تھا۔ گھر کی عزت ہوتی بے مردانے سے اور مردانے کی رونق مردوں سے۔ مردوں کے شوق کے اہتمام سے بتانا کبھی جس کا یہ حال تھا کہ بالوں میں تیل نہ پڑتا تو سر درد کرنے لگتا۔ دن میں اگر چار مرتبہ گھر سے باہر نکلتا تو چار طرح کی پوشاک پہن کر ایک چیز ایک جگہ سے بے جگہ رکھی ہوتی تو بے چین ہو جاتا فرش پر سلوٹ پڑی دیکھی اور تیوری بل پڑا، آندھی ہو مینہ ہو سردی ہو گرمی ہو چار گھڑی دن رتبہ گھوڑے کی سواری کبھی مانگہ ہونے نہیں دی۔ ہر چیز صاف ستھری قیمتی انوکھی یا اب خانہ داری کے جھگڑوں نے اس کو اس قدر عاجز اور ناچار کر دیا تھا کہ اس کو اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہ تھا۔ بال الجھ کر مندہ ہو گئے کسی کو دماغ بے کنگھی کرے، معلوم ہے کہ کپڑے میلے چکے ہو رہے ہیں۔ مگر بدلتے ہوئے آتی بے چیز بے ٹھکانے پڑی بے مگرز بان کون بلائے کہ اس کو موقع سے رکھو۔ سفید چاندنی دھبے پڑ پڑ جا جم بن گئی بے نوکروں کو تو نفع نہیں کہ بدلیں، میاں کو خیال نہیں کہ بدلائیں۔ گھوڑا نسل ولایتی جس پر کبھی پھسلتی تھی۔ پٹھوں پر نالی پڑی ہوتی سواری جو ہوئی موقوف تھان پر بندھے بندھے پانچواں صیب نکال لایا بادی نے آدبا، مالش میں ہوئی کمی اور دانے میں ہوئی چوری تھوڑے دن میں پر تل کاٹھو معلوم ہونے لگا۔ سینکڑوں روپے کا اسباب صرف غور اور پرداخت کے نہ ہونے سے کوڑے کی طرح بے قیمت ہو گیا۔ غرض وہ لوگ کہاوت کہتے ہیں کہ دو ملا میں مرغی حرام، دو بیہیوں میں

کشکش میں گھر کی منی ایسی پلید ہوئی کہ باہر سے لے کر اندر تک کبوت اور منطسی اور بے رونقی چھا گئی ایک مدت تک غیرت نیگم کی طرف سے انواع و اقسام کے ظلم ہریالی پر ہوتے رہے۔ اور بدلہ لینا کیسا اس کی اتنی بھی مجال نہ تھی کہ اف کرے نام لے لے کر پکار پکار کر سنا کر گالیوں کی بو چھاڑ برسا رکھی ہے۔ اور کوسنوں کا تار باندھ دیا ہے۔ اور دم بخود۔ مگر کتنا صبر کہاں تک برداشت۔ آخر اس کا منہ کھلا کہ اوگوں نے اپنے اپنے کان بند کر لیے برکت، رونق فراغت، عافیت، محبت، مروت سب کچھ غارت ہو کر ایک آبرو و دہی محلے والوں کی نظر میں نہ رہی تھی۔ ہر وقت کی تھکا ہنسیخت میں وہ بھی گئی گزری ہوئی۔ کم تخمیں اس بے ہودگی کے ساتھ آپس میں لڑتی تھیں کہ کھڑنوں قصانوں کو مات کر دیا تھا۔ اور دھوہنوں بھٹیاریوں کو شرمندہ۔ غیرت نیگم تو کسی کے قابو کی تھی نہیں۔ مگر ہاں ہریالی کو اگر بتلا منع کر دیتا تو وہ بے شک باز آ جاتی۔ پر غیرت نیگم کی طرف سے بتلا کو ایسے ایسے رنج پہنچے تھے کہ روکنا کیسا وہ تو کبھی کبھی ہریالی کو اور اشتعال دے دے کر اس کی آڑ میں اپنے دل کے جلے پھپھو لے پھوڑ لیتا تھا۔ ان اوگوں میں جو بانہی رنجش اور عداوتیں تھیں، پہلے چند روز تک دل میں رہیں۔ بڑھتے بڑھتے دلوں سے منہ تک آئیں، اب وہ زیادہ ہونیں تو پھوٹ کر ایسی بنیں جیسے کوہ آتش فشاں کا ملغوبہ آگے آگے آپ اور پیچھے پیچھے بنا ہی اور بربادی۔

ہریالی کا امید سے ہونا، غیرت بیگم کا اس بات کو جاننا، اور اپنی ماما خاتون سے اس کو نکھیا دلوانا، مقدمہ کا کو تو اہلی میں دائر ہونا اور آخر ناظر کی تدبیر سے دب دیا جانا، مگر بتانا کا دیوالہ نکال کر

اتفاق سے ہریالی پڑی بیمار شاموں شام سردھویا۔ سردی کھائی زکام ہوا بخار آنے لگا۔ چند روز کچھ دھیان نہ کیا۔ بخار تھا کہ چم چپڑ ہو گیا۔ بلکہ ذرا ذرا کھانسی کی بھی دھسک شروع ہو گئی معمولی طور پر حکیموں کے علاج کیے منضج ہوئے۔ بخار بے کہ جنبش نہیں کھاتا۔ کھانسی کو اتنا آرام ہوا جھوسو کھی سے تر ہو گئی۔ ایک دن باغم میں کچھ سرخی کی جھلک دکھائی دی تو تردد ہوا اور تردد کی بات ہی تھی خیال کیا کہ پان کی سرخی ہوگی مگر پھر ثابت ہوا کہ نہیں خون کی بے۔ تب تو بتانا گھبرایا۔ غیرت بیگم کے ہاتھوں سے تو ایسی ایسی اینٹیں پہنچی تھیں کہ اس کے نام سے اس کا دل بے زار تھا۔ اس کو تھوڑی یا بہت جو کچھ دل بستگی تھی ہریالی کے ساتھ تھی۔ اب جو اس کو خون تھوکتے دیکھا۔ قریب تھا کہ سودائی ہو جائے۔ شبہ تو تھا کئی دنوں سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہیں غیرت بیگم نے کچھ کر کر دیا ہو۔ کھانسی کے ساتھ خون کا آنا تھا کہ یقین کیسا حق الیقین ہو گیا کہ غیرت بیگم نے پون بٹھائی خدا نخواستہ ایسا تو پرانا بخار بھی نہیں کہ سل ہونے کا اندیشہ ہو ڈھونڈ ڈھونڈ کر سیانے اور بھگت بائے! آئے سب نے اپنے اپنے جادو چائے مگر کم بخت پون کی کچھ اصل جادو کی کچھ حقیقت ہو تو روگ میں کمی مرض میں خفت ہو۔ خطبے کے جادو وہم کی پون اس کو اتارے کون، ہریالی کا حال بہت پتا چلا۔ آخر کسی نے صلاح دی کہ سب کچھ تو کر چکے ذرا ڈاکٹر چینیلی کو بھی تو ایک نظر دکھاؤ۔ چینیلی کا نام اصل میں مس بلی تھا۔ ولایت سے نئی آئی تھی۔ کہ اس نے نواب اقتدار الدولہ بہادر کے محل میں ایک بڑے معرکے کا علاج کیا۔ تب ہی سے شہر میں بڑی شہرت ہوئی۔ نواب صاحب کی محل سرا میں اس کو چینیلی پکارتے تھے۔ وہاں کی سنی سنائی اور لوگ بھی چینیلی کہنے لگے۔ دایہ گری کے فن میں نہایت تجربہ کار اور مشاق تھی۔ اور خود بتانا کے گھر میں معصوم اور بتول دونوں کے ہونے میں بائی گئی تھی۔ ہریالی اور ہریالی کے تیمار دار کسی کے ذہن میں بھی نہیں بات آئی تھی کہ ہریالی کی حالت ڈاکٹر چینیلی کے علاج کی متقاضی ہے۔ ڈاکٹر چینیلی کو جب بلایا گیا، تو غیرت بیگم سمجھ کر معرفت سابقہ کے لحاظ سے بلا عذر بڑی خوشی کے ساتھ فوراً چلی آئی۔ اس کو یہاں آ کر معلوم ہوا کہ بتانا نے دوسری بی بی کی بے۔ اس نے بیمار کو دیکھا تو سہی مگر بتانا سے کہا کہ مجھ سے اور غیرت بیگم سے دوستی یا بہنا پاتا تو نہیں ہے پر تم کو پتہ ہے کہ ان کے دو بچے ہونے میں، میں نے ان کی خبر گیری کی ہے۔ تو تمہاری اس بی بی کا علاج کرنے کو میرا جی نہیں چاہتا۔ اس کو میں خلاف مروت سمجھتی ہوں اور میرے علاج کی چنداں ضرورت بھی نہیں جس حکیم کا علاج کرتے ہو ان کو صرف اتنا اشارہ کر



دینا کہ دو جانوں کی رعایت سے علان کریں، اتنا کہہ کر ڈاکٹر غیرت بیگم کی طرف گئی۔ 'معصوم اور بتول دونوں کو گود میں لے کر پیار کیا۔ پھر غیرت بیگم سے بولی کہ اگر میں دوسرے گھر میں نہ بلائی گئی ہوتی تو میں تم سے پوچھتی کہ اس قدر دہلی کیوں ہو۔ ہم لوگوں میں مرد دوسری بی بی نہیں کر سکتے اور مرد اور عورت دونوں کے حقوق کو تو لا جائے تو شاید عورت ہی کا پلہ جھکتا ہو اور بے گاہ پھر بھی مرد اور عورت کا تعلق اس قسم کا بے کیا ہو جانے سے عورت مرد کے بس میں آ جاتی ہے۔ یہی سمجھ کر میں نے اپنا پیادہ نہیں کیا اور کرنے کا ارادہ بھی نہیں۔ میں تمہاری حالت پر افسوس کرتی ہوں اور اس سے زیادہ افسوس اس مجبوری کا بے کہ مدد کرنے کی جگہ نہیں۔ لیکن کبھی اگر میرا کام آپڑے تو ضرور مجھ کو یاد کرنا۔ غیرت بیگم نے اگرچہ دیہات میں پرورش پائی تھی۔ پر وہ اتنی بھی تو بے تمیز نہیں تھی کہ چنبیلی کے آنے کا اس کی محبت کا، مروت کا ہمدردی کا شکریہ ادا نہ کرتی۔ مگر سوکن کے جھگڑے سے اس کو کسی چیز کی سدھ نہ تھی۔ چنبیلی اس سے بات کر رہی تھی اور یہ اس فکر میں تھی کہ کب چپ کرے اور میں سوکن کا حال پوچھوں، غرض غیرت بیگم نے چھوٹے ہی پوچھا: کہو کیا دیکھا۔ چنبیلی بولی حکیم کو دھوکا ہوا۔ اس نے پہچانا نہیں کہ یہ عورت چار مہینے ہوئے دوجی سے بیٹھی ہے، میں نے تمہارے میاں کو جتا دیا ہے۔ اب بھی اگر سمجھ بوجھ کر علان ہو گا تو بچے کو تو میں نہیں کہہ سکتی کیونکہ ادھر تو ہوئے جلاب اور ادھر بخار کی وجہ سے ملیں اوپر تلے ٹھنڈی ٹھنڈی دوائیں بچے کو سردی نے پکڑ لیا۔ مگر احتیاط کی وجہ تو میرے نزدیک بچے والی کو ابھی تک کچھ بڑی جوکھوں نہیں ہے۔ اس لیے کہتے ہیں کہ آدمی فربہ شود از راہ گوشت۔ ہریالی نے جوسنا تو اس کے دل کو اس قدر تقویت پہنچی کہ کیسی دوا اور کس کا علان گھڑیوں اس کا مزاج خود بخود ڈھیک ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ یا تو آپ سے کروٹے نہیں بدل سکتی تھی یا ایک ہی ہفتے میں چلنے پھرنے لگی۔ یہ تو اٹھ گھڑی ہوئی اور اس کی جگہ غیرت بیگم پڑی۔ غیرت بیگم کا سارا غرور، سارا گھمنڈ، سارا ناز بے جا واد کے برتے پر تھا۔ اب جو اس نے دیکھا کہ سوکن نے اس میں۔ ما جھاڑ لایا تو حقیقت میں اس کی کمر ٹوٹ گئی۔ اور سمجھی کہ بس اب ہریالی کے مقابلہ میں نہیں پہنچی۔ اس کو اس بات کی بڑی تسلی تھی کہ ہریالی لا کھ میاں کی پیاری کیوں نہ ہو۔ آخر بے تو بے والا نہ کوئی نام کا لینے والا نہ پانی کا دینے والا۔ جتنا اس کی تقدیر میں ہے اور پہن لے، جس قدر اس کے نصیب کا ہے پھر میں ہوں تو میں اور نہیں تو اللہ رکھے اور پروان چڑھائے میری والا اس خیال سے کبھی اس نے سوکن کو سوکن مانا ہی نہیں۔ اب البتہ اس کو سوکن کی حقیقت کھلی اور آدھی اور ساری کی سوچ پیدا ہوئی۔ چنبیلی ایسا کوئی دو تین گھڑی دن چڑھتے آئی تھی۔ اس کے گئے پیچھے سے جو غیرت بیگم گھنٹوں میں مردے کر بیٹھی تو دو پہر ڈھلتے ڈھل گئی۔ مگر اللہ کی بندی نے گردن اونچی نہ کی۔ دو تین بار کھانے کی اطلاع ہوئی مگر اس نے یہی کہہ دیا کہ مجھے بھوک نہیں۔ اس کے گھر میں ایک بہت پرانی نوکر تھی، خاتون ود گھر کی داروغہ تو نہ تھی، مگر کبرسنی اور قدیم الخدمتی اور ہوشیاری اور سلیقے کی وجہ سے گھر کے نوکروں میں سے سب سے سربر

آوردہ تھی۔ غیرت بیگم کو اس سے مانوس ہونے کا ایک سبب خاص یہ بھی تھا کہ جس طرح بتانا نے غیرت بیگم پر سوکن کی اسی طرح خاتون پر بھی اس کے میاں نے سوکن کی تھی۔ غیرت بیگم کا تو ایسی باتوں میں بہت جی لگتا تھا۔ خاتون گھڑیوں اپنی سوکن کی باتیں کرتی اور غیرت بیگم کرید کرید کر پوچھتی اور ایک ایک بات کو بار بار کہلاتی۔ پس خاتون نوکر کی نوکر تھی قصہ خواں کی قصہ خواں اور بیوی کی ہمدرد۔ جب خاتون نے دیکھا کہ جس گھڑی سے چنبیلی آئی بیوی کچھ ایسی سوچ میں گئی ہیں کہ پان تک نہیں کھایا۔ کھانے کا وقت بھی ٹل گیا۔ تو اس نے قریب جا کر پوچھا کہ ”بیوی جو تم اس قدر اداس بیٹھی ہو اس کا سبب کیا ہے۔ غیرت بیگم تم نے نہیں سنا کہ بے غیرت کے یہاں بال بچہ ہونے والا ہے۔ ابھی اس نے کیا اٹھا رکھا ہے بال بچہ ہونے والا ہوتا تو حکیم کیا ایسے اندھے ہیں۔ جاہلوں پر جاباب کیوں دیتے۔

غیرت بیگم: حکیموں کو دھوکا ہوا، انہوں نے جانا ٹھنڈی ٹھنڈی دوائیں دی جا رہی ہیں۔ پیٹ میں بادی بھر گئی ہے۔ اب چنبیلی نے دیکھا تو بتایا۔ کیوں خاتون بی میں تو سنتی تھی، کنچنیوں کے اولاد نہیں ہوتی؟ کیا میری ہی تقدیر پر ایسے پتھر پڑے تھے کہ مجھ پر کنچنی بھی آئی تو آتے دیر نہ ہوا اور ماں بن جائے۔

خاتون: نہیں بی بی کون کہتا ہے کہ کنچنیوں کے اولاد نہیں ہوتی؟ ہوتی ہے اور نہیں بھی ہوتی۔ کیا تم بھول گئیں میری سوکن کون تھی۔ اصل نسل کی کنچنی۔ جب میرا میاں اس کو لایا تو خدا جانے نامرادیں مردوں کی آنکھوں میں کیا مپکی ڈال دی ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ سترہ اٹھارہ برس کی لڑکی ہے۔ پیچھے معلوم ہوا کہ چار کی ماں تو وہ اس وقت تھی اور ہمارے یہاں تو بیوی پانچ برس و دجی میری اتنی روک ٹوک پر سات یا آٹھ دفعہ اس نے تیاری کی مگر وادہ ری چنیا۔ دائی ہو تو ایسی ہو کبھی چوتھا نہ لگنے دیا۔

غیرت بیگم: وہ چنیا اب ہے۔

خاتون: مدتیں ہوئیں مر کھپ گئی۔ سترہ پچتر برس کی تو وہ میری سوکن کے وقت میں تھی۔

غیرت بیگم: پھر خاتون۔ کوئی ویسی ہی تدبیر یہاں نہیں کرتیں۔

خاتون: بیوی تمہارے یہاں افتاد دوسرے طور کی ہے۔ ہم تو غریب آدمی ہیں۔ اب بھی ہیں اور تب بھی تھے۔ میاں سات روپے مہینے پر ایک عطار کی دوکان پر بیٹھتا تھا۔ سامنے تھا اس بیسوا کا کوٹھا۔ آدمی تھا وہ تھی طرح داروہ نامراد اس کے سر ہوتی میں بارو آنے مہینے کرائے پر دینا بیگ خاں کے کنوے میں رہتی تھی، ذرا مکان میرے اکیلے دم کا اس میں گزر ہوتا تھا۔ سوکن صاحب جو آئیں بس میری گود میں بیٹھیں، مردواکم بخت اس طرح کا ظالم کہ گالی دے بیٹھا اس کے آگے ایک بات اور بات بات میں مکا اور امات۔ اگر وہ کبھی مجھ کو اور سوکن کو آپس میں لڑتے دیکھ پائے تو دونوں کے

ڈنڈے لگائے۔ سو بیوی اپنی عزت اپنے ہاتھ میں نے تو چوں نہیں کی اور ظاہر میں سوکن سے ایسی گھلی ملی رہی جیسے سگی بہن پر دل سے تو میری جان کی دشمن تھی اور میں اس کی۔ ایک جگہ کے رہنے سہنے اور ظاہر کے میل ملاپ سے ایک یہ فائدہ تو تھا کہ میں جو چاہتی سو کر گزرتی تھی۔ اس کو یا مردوے کو شبہ نہیں ہونے پاتا تھا۔ تمہارے یہاں بیوی اول دن سے کھلم کھلا بگاڑ پڑے ہوئے ہیں۔ ایسی جگہ کوئی تدبیر چلنی ذرا مشکل ہے، نہیں تو کیا بڑی بات ہے چننا نہیں، چننا کی بہنیں اور بہتری اور دائی کا بھی اس میں کیا کام۔ ایک سے ایک دو مجھ کو ایسی معلوم ہے کہ چنکی بجاتے میں کھڑا کھٹکانہ کھائے۔

غیرت بیگم: اے بے اچھی میری خاتون ایسی کوئی دوا ہے تو ضرور مجھ کو بتاؤ۔

خاتون: دوائیں تو بہت پرکاڑھے ہیں پینے کے کچھ لیپ ہیں لگانے کے۔ آج کو یہاں دوا بنتی چھنتی ہوتی تو کچھ بھی مشکل نہ تھا۔ دوا تو بناتے ہیں اپنے ہاتھوں سے میاں کوئی کرے تو کیا کرے۔

غیرت بیگم: پھر تم ہی کچھ تدبیر نکالو گی تو نکلے گی ورنہ میں تو اپنی جان پر کھیلے بیٹھی ہوں اور یہی بات اس وقت میں سوچ بھی رہی تھی۔ خدا مجھے تو اس دن کے واسطے نہ رکھے ہائے کن آنکھوں سے دیکھوں گی کہ اس کے بچے کھیلے پھریں۔ اور کن کانوں سے سنوں گی کہ اماں پکاری جائے۔ تم سے کچھ ہو سکتا ہے تو کرو نہیں تو تم اکیلی کیا دنیا دیکھ لے گی کہ جابا وادل بہت برا ہوتا ہے۔ اور کسی پر زور نہیں چلتا۔ اپنی جان تو بس کی ہے۔ جان جائے کسی کی بلا سے، غیرت میرا نام ہے، نام کے پیچھے جان دوں تو جی۔

خاتون: بیوی خدا کے واسطے تم ایسی ایسی باتیں میرے سامنے تو کرو مت، سن سن کر میرے تو ہوش اڑے جاتے ہیں۔ جان سی چیز کہاں پائیے، تم اپنے ننھے منے بچوں کا منہ کرو۔ خدا تمہاری سلامتی میں ان کو پروا نہ چڑھائے۔ الٹی تم کو ان کی بہاریں دیکھنی نصیب اور قربان کی ودا تمرا دسو کن خدا چاہے گا تو وہی نہ رہے گی۔ ہر اسماں ہو تمہاری بلا اور غم کرے تمہاری پاؤش۔ جب خدا نہ کرے تمہاری ہی جان پر آئے گی تو ہم پندرہ بیس بندے جو تمہاری جوتیوں سے لگے ہیں تو کیا منہ دیکھنے کے واسطے ہیں۔ پہلے ہم سب تم پر سے تصدق ہو لیں گے تب جو بات سو بات۔ پر بیوی جو بات تم چاہتی ہو جان جو کھوں کا کام ہے۔ پہلے اپنی جان سے ہاتھ دھو لو تو اس کا بیڑا اٹھائے۔ پھر اس کو چاہیے دل کا پکا پیٹ کا گہرا بھروسے کا پورا کہ خدا نخواستہ کل کا اس کو کچھ ایسی ویسی ہو تو اپنے اوپر جھیل لی جائے اور مالک کو بال بال بچائے سو تمہارے گھر میں تو میں اس ڈھب کا کسی کو نہیں پاتی۔ چھوکر یاں ہیں چھچھوری کہ آدھی بات سن پائیں تو ایک ایک کی چار چار دل سے بنائیں اور سارے محلے میں دھوم مچائیں۔ رہ گئیں ماماں، نوکریں تو ہر کسی سے کہتے جی لرزتا ہے۔ اور مجھ اکیلی سے سارا سر انجام ہو نہیں سکتا۔ ایک میرا بھانجا ہے جو میرے میاں کی جگہ عطار کی دکان پر نوکر ہے۔ اگر وہ گنٹھ جائے تو سارے

کام آسان ہیں۔ دیکھو میں اس سے ذکر کروں گی پر بیوی تم اپنی جگہ پر سمجھ لو میری تو اگر جان بھی تمہارے کام آجائے تو دریغ نہیں۔ میں نے تمہارا نمک کھایا ہے۔ اور میں اب دنیا میں جی کر بھی کیا کروں گی بہتیرا جی چکی پر میرا بھانجا بال بچے دار آدمی ہے۔ عمر بھی اس کی کچھ ایسی بہت نہیں۔ اس کو تو کچھ ایسا ہی بھاری لالچ دیا جائے گا تو شاید وہ اس کام میں ہاتھ ڈالے۔

غیرت بیگم: مجھ کو تو اگر کوئی کھڑا کر کے بیچ لے تو بھی عذر نہیں پر کسی طرح اس عذاب سے چھٹکارا ہو۔

خاتون: بیوی دیکھو خبردار میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں کسی کو کانوں خبر نہ ہو۔ نہیں تو سارے گھر پر آفت آجائے گی۔

غیرت بیگم: خیر مناؤ تم نے کیا مجھ کو ایسا نادان سمجھ رکھا ہے۔ میں خوب سمجھتی ہوں کہ بڑے اندیشے کی بات ہے۔ مجھ کو اپنے دونوں بچوں کی جان کی قسم کیا مجال کہ منہ تک بات آجائے۔

خاتون: تو بس بات کو اپنے ہی تک رہنے دو۔ جب سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا تو میں تم کو خبر کر دوں گی اور

میں تم کو یہی صلاح دیتی ہوں کہ مل جاؤ، کیونکہ ملاپ میں خوب کام نکلتا ہے۔ مگر ملو نہیں تو یہ ہر وقت کا جھگڑا۔ بکھیرا تو موقوف کر دو۔ ورنہ کرے گا کالا چور اور پکڑے جائیں گے تمہارے دشمن برا چاہنے والے خاتون کے سمجھانے بھانے سے غیرت بیگم نے باوجود یکہ تا وقت ہو گیا تھا منگوا کر کھانا کھایا۔ اور جو سارے سارے دن ہریالی کا جھگڑا لگا رہتا تھا وہ بھی بند

ہوا۔ آدمی لاکھ چھپائے پر دل کی کپٹ ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتی لوگ جو چوری یا دوسرے جرموں کے مرتکب ہوتے ہیں اپنے پندار میں بڑی بڑی پیش بندیاں کرتے ہیں اور آخر کو وہی پیش بندیاں ان کو رسوا اور فضیحت کراتی ہیں۔ یا تو تمام دن دونوں سوکنوں کی لڑائی کا ایک نل پڑا رہتا تھا ایک دم سے ہوا سناٹا تو غیرت بیگم اور خاتون کے سوائے سبھی کو حیرت تھی کہ دلوں میں ایسی کیا نیکی خدا نے ڈالی کہ آپ سے آپ لڑتے لڑتے رک گئیں باوجود یکہ خاتون نے سمجھا دیا تھا کہ جب سب

ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا تو میں تم کو خبر کر دوں گی مگر غیرت بیگم کو اتنا صبر کہاں تھا اس نے تو اگلے ہی دن سے خاتون کی جان کھانی شروع کر دی۔ کیوں بی کب ہو گا کیا دیر ہے کاب، کا انتظار ہے۔ اے بے کبھی ہو بھی چکے گا یا نہیں۔ بس اب خاک ہو گا تم کو نہیں کرنا منظور تھا تو مجھ کو آس کیوں دی تھی۔ نخی سے شوم بھلا جو تر ت دے جواب آخر جب تقاضا حد سے گزر گیا تو ایک دن خاتون نے کہا اب بی خدا نے مجھ کو تم سے سرخرو کیا اب کہیں اتنے دنوں میں جا کر بڑی مشکل سے معاملہ طے ہوا۔

میں تو سمجھتی تھی خدا جانے سرے سے حامی بھی بھرے یا نہ بھرے، تو دس ہزار مانگے پندرہ ہزار مانگے پر ماشاء اللہ قسمت تمہاری بڑی زبردست ہے۔ سستا چک گیا ایک ہزار اور جو خدا نہ کرے کہیں کھل کھلا پڑے تو دو ہزار ”غیرت بیگم تو کبہ ہی

چکی تھیں اگر مجھ کو کھڑا کر کے بچ ڈالے تو بھی عذر نہیں۔ سننے کے ساتھ لگی ہاتھوں سے سونے کے ٹھوس کڑوں کی جوڑی اتارنے کے اتنے میں خاتون بولی، 'بیوی کڑے مت دو۔ میرا جی کڑھتا ہے ننگے ہاتھ برے لگیں گے اور لوگوں میں بھی پرچول پڑے گی بلکہ جتنا گہنا تم پہن رہی ہو اس میں سے کچھ بھی مت دو۔ غرض جس طرح خاتون کبھی گئی کچھ نقد و جنس ملا کر ہزار پورے کر اس کے لیے باندھے ہزار مٹلے اور ہزار غیر مٹلے کے یہ لے خاتون نے یہ کار نمایاں کیا کہ چوبیسوں کے بہانے سے تھوڑی سی بھانجے سے مانگ لائی۔ دونوں گھروں میں دودھ کا راتب بندھا ہوا تھا۔ گھوسن بڑے سویرے آتی اور سب سے پہلے یہیں کا راتب لاتی۔ خاتون اندھیرے منہ اٹھ مردانے میں جا بیٹھی، جوں ہی گھوسن نے پاؤں اندر رکھا کہ خاتون نے اس سے لڑنا شروع کیا کہ۔ ماری دنیا میں حلوائی ہوئے گھوسن ہوئے دودھ میں پانی ملاتے ہیں۔ یہ کہیں سے بے چاری انوکھی گھوسن نکلی کہ پانی میں دودھ ملا کر لاتی ہے۔ پرسوں کھیر کچی کسی نے منہ پر نہیں رکھی، کل جوں چابا کہ سویوں میں ڈالیں نیلا نیلا سوت پانی ہر روز بیوی کو ہم لوگوں پر خفا کرواتی ہے لا تیری ہنڈیاں بیوی کو لے جا کر دکھاؤں تب تو انہیں یقین آئے گا۔ غرض زبردستی گھوسن کے ہاتھ سے ہنڈیا چھین ڈیوڑھی میں لے گھسی اور سکھیا کی پڑیا دودھ میں گھول ہنڈیا گھوسن کو پھیر دی کہ بیوی کبھی ہیں میرے پاس حرام کا پیسہ نہیں ہے جادو رہا اب میرے گھر دودھ نہ لانا۔ برسوں کی لگی ہوئی گھوسن اور روزگار کا راتب اس طرح ملوئی کرتی تو اتنی مدت کیوں کر بھتی بے چاری روکھنی اور کھسانی ہو کر خاتون کا منہ دیکھنے لگی اور چھوٹے گھر کی ماما کو آواز دے بھری ہنڈیا اس کے حوالے کی کہ بڑی بی نے تو آج کئی برس کے بعد جواب دیا چھوٹی بی بی بھی اگر دوسری گھوسن لگالیں تو میری ہر روز صبح سویرے کی اتنی دور کی رڑ بچے۔ ہریالی نے دیکھا تو دودھ ہر روز جیسا گاڑھا اور پکنا اس کے جی میں آ گیا کہ میاں کئی بار فرنی کی فرمائش بھی کر چکے ہیں لاؤ آج تلفیاں جمادیں۔ سارے کا۔ مارا دودھ لے لیا۔ جب دودھ لے چکی تب اس کو خیال آیا کہ آج تو بڑے گھر کی باری ملے ہے، ماما سے کہا دیکھا تو نے کیا مجھ سے بھول ہوئی۔ بڑے گھر کی باری کا خیال نہ رہا اور فرنی کے لیے اتنا۔ مارا دودھ لے بیٹھی۔ اب کیا کروں۔ ماما نے کہا۔ مضائقہ کیا ہے جاڑے کے دن ہیں۔ اس وقت کی جی ہوئی باسی تلفیاں تو کل تک ٹھنڈی اور بھی مزے کی ہوں گی، غرض فرنی پکا تلفیاں بھر الماری میں رکھ اوپر سے قفل لگا دیا۔ جن لوگوں کے بال بچے نہیں ہوتے جی بہانے کو اکثر جانور پال لیا کرتے ہیں۔ ہریالی نے بھی طوطا اور مینا اور بلی اور کبوتر اور مرغیاں بہت سے جانور پال رکھے تھے۔ اچھا ایک پیالہ بھر کر فرنی ان جانوروں کے لیے الگ نکال کر تھوڑی ماما کے لیے دیگھی میں لگی چھوڑ دی تھی۔ دوسیر دودھ مساکرے پاؤ بھر چاول برابر کی کھاڈ فرنی کا ہے کونسی اچھا خاصا کھانا چاہیے جس نے پانی خوب مزے سے کھائی۔ دو گھنٹے نہیں گزرنے

پائے تھے کہ سب سے پہلے میاں مٹھوٹیں ہوئے، پھر تو باری باری سے اوپر سویر کوئی جلدی، کوئی دیر، مینا سکڑی، بلی بولائی، کبوتر چکرائے، مرغیاں اونگھنے لگیں۔ ماما مارے تے اور دستوں کے بدحواس ہو گئی، ڈولی میں ادا اس کے گھر پہنچا دیا اس کا بیٹا تھانے میں نوکر تھا۔ سننے کے ساتھ بھاگا ہوا آیا۔ ماں کو دیکھا تو آدمی کو نہیں پہچانتی تھی۔ نیم جان کو اٹھا کر ہسپتال لے گیا۔ ڈاکٹر نے پچکاری سے پیٹ صاف کیا۔ پانی جو پیٹ میں سے نکلا تھوڑے سے میں کوئی دوا ڈال دیکھا تو سنکھیا تھی۔ آخر ڈاکٹر نے سوچ سوچ کر یہ کہا کہ ہم یہ نہیں بتا سکتے کہ اس نے کتنی سنکھیا کھائی اور ٹھیک کس وقت کھائی لیکن جس قدر اس کے پیٹ میں سے نکلی ہے۔ اگر اتنی بھی ہضم ہو کر خون میں مل گئی ہوگی تو قاعدے کی رو سے اس کو مرنا نہیں چاہیے۔ غرض سنکھیا کے توڑ کا جو تریاق انگریزوں کے یہاں ہوتا ہوگا اوپر تلے دینا شروع کیا۔ اگلے دن صبح ہوتے ہوتے بیمار کی طبیعت کچھ سنبھلی آخر لوٹ پیٹ کر کچھ اچھی تو ہوئی مگر کچھ ایسا روگ لگ گیا کہ جب تک زندہ رہی مارے دھڑکن کے بے چاری کو ساری ساری رات بیٹھنے لگی رجاتی تھی۔ ادھر ہریالی کے یہاں جس جس جانور نے ذرا سی فرنی کھائی سبھی کی تو موت آئی۔ ہریالی اپنے اس کنبے کے سوگ میں تھی کہ کوئی چار گھڑی دن رہتے تو کوٹوالی کے لوگ مردانے میں آ بھرے پکڑ دھکڑ ہونے لگی فرنی کی قلفیاں اور مرے ہوئے جانوروں کی لاشیں تو کوٹوالی والوں نے فوراً ہسپتال کو ڈاکٹر کے پاس چلتی کیں اور لگے اپنے دستور کے مطابق ایک ایک کو الگ الگ لے جا کر پوچھ گچھ کرنے۔ غرض چھ گھڑی رات کو توپ نہیں چلی تھی کہ کوٹوالی والوں نے سارا مقدمہ مرتب کر لیا۔ محلے والوں نے اظہار دیئے کہ دونوں گھروں میں ہر وقت کو سم کاٹا رہا کرتی تھی۔ اب ہفتے عشرے سے امن ہے۔ گھوسن نے بیان دیا کہ میں مدت سے دونوں گھروں میں دودھ کا راتب لاتی ہوں۔ کبھی کسی نے دودھ کو برا نہیں بتایا۔ کل خاتون نے پہلے پہل مجھ سے کہا کہ تیرے دودھ میں مالونی ہوتی ہے اور ہنڈیا میرے ہاتھ سے لے ڈیوڑھی میں گھس گئی اور پھر اٹے پاؤں ہنڈیا لے کر باہر آئی کہ بیوی نہیں تھیں میں نے وہی ہنڈیاں جوں کی توں چھوئے گھر میں بھیج دی۔ دونوں گھروں کی ماماؤں نے یک زبان گواہی دی کہ گھوسن نے دودھ کبھی برا نہیں دیا۔ حکیم عطار نے تصدیق کی کہ میری دکان پر خاتون کا بھانجا بیٹھتا ہے اور جس دن میں دکان پر نہیں ہوتا وہی بیچتا کھوچتا ہے اور میری دکان میں سنکھیا بھی رہتی ہے مگر میری سخت تاکید ہے کہ دیکھو سنکھیا، کچلا، جمال گھوٹا، شخرف، ہڑتال، چنناگ، دھتور داس قسم کی چیزیں انجان آدمی کے ہاتھ مت بیچنا۔ ان چیزوں کی فروخت کا حساب کتاب میں کیا شہر میں کوئی عطار بھی نہیں رکھتا۔ خاتون کے بھانجے کو بلوایا۔ بہتیرا ڈھونڈ اتفاق سے اس وقت نہیں ملا بلکہ کوٹوالی والوں کو شبہ ہوا کہ کہیں خبر پا کر روپوش تو نہیں ہو گیا۔ بس اس کے آنے کی کسر رہ گئی ورنہ مقدمہ اسی وقت لکھا پڑھی ہو کر چالاں ہو جاتا۔ گھر کے نوکروں میں خاتون ذرا سب سے زیادہ معزز تھی اور ڈیوڑھی تک بھی بہت ہی کم آتی جاتی تھی۔ کوٹوالی والوں کو ہوا تامل کہ اس کو دوسرے

نوکروں کی طرح باہر بلوائیں یا آپ ڈیوڑھی کے پاس جا کر اس سے پوچھ پچھ کر لیں۔ اتنے میں تو سید ناظر خیر پا کر آمو جو ہوئے۔ اگر ناظر ذرا سی دیر اور نہ آتے تو خاتون کی کیا اصل تھی کو تو الی والے تو اس کے اچھے سے قبول کروا لیتے بلکہ وہ اس فکر میں تھے کہ اپنی طرف سے کسی عورت کو اندر بھیج کر خود بیگم صاحبہ کی مزاج پرستی کریں۔ ناظر کا آنا تھا کہ مقدمے کا رنگ بدل گیا۔ کو تو الی نے مناسب سمجھا کہ رات گئی زیادہ اس وقت تحقیقات کو ملتوی کیا جائے۔ فرنی کی قلفیاں اور مرے ہوئے جانوروں کی لاشیں یہی دو بڑے ثبوت تھے سو دونوں ہمارے ہاتھ میں ہیں۔ اب ناظر نہیں ناظر کے باپ بھی قبر سے اٹھ کر آئیں تو کیا کر لیں گے ماما کے پیٹ میں سے سکھیا نکل چکی ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ اتنے مارے جانور سب سکھیا سے مرے اور فرنی میں سکھیا موجود اب رہ گئی یہ بات کہ سکھیا دی تو کس نے دی۔ سو نہ دونوں سوکنوں سے انکار ہو سکتا ہے اور نہ دونوں کی عداوت سے۔ زہر خوردنی کا مقدمہ اس سے زیادہ اور کیا ہو گا۔ صاحب مجسٹریٹ کو تو الی کے چالان کئے ہوئے مجرم اکثر چھوڑ دیا کرتے ہیں اور ان کو کو تو الی کے ساتھ خدا واسطے ایک ضد سی آپڑی ہے۔ لیکن اگر اس مقدمے کو بگاڑا تو علم کی قسم صاحب سپرنٹنڈنٹ کو سمجھا کر صدر کو ایسی رپورٹ کراؤں کہ جواب دیتے بن نہ پڑے اور میاں ناظر کو بھی وکالت کا بڑا گھمنڈ ہے۔ بڑی مدت میں اونٹ پہاڑ کے تلے آیا ہے دیکھیں تو اب ہائیڈروٹ کی کون سی نظیر پیش کر کے بہن کو بچاتے ہیں۔ غرض کو تو ال خاتون کو ناظر کے سپرد کر حوالہ نامہ لکھوا گھوسن کے ساتھ سے چلتا ہوا اور سیدھا پہنچا صاحب سپرنٹنڈنٹ کے پاس اور ان کو مقدمے کی روداد سمجھا کر کہا کہ مقدمہ ہے سنگین اور مجرم عورتیں پر وہ نشیں سید ناظر وکیل کا نام حسور نے سنا ہو گا۔ اصل میں ان کی بہن نے سوکن کو زہر دلوایا مگر وہ اتفاق سے بچ گئی کل حسور بھی واقعہ واردات تک چلیں ورنہ وکیل صاحب بڑے شور و پشت اور ثقہ بد معاش ہیں۔ ہم لوگوں کے قابو میں آنے والی اسامی نہیں۔ ادھر بہن کے پاس تو دیکھا مارے بول کے دست پر دست چلے آ رہے ہیں۔ دیکھنے کے ساتھ ہوش ہی تو خطا ہو گئے اور سمجھا سب سے بڑا ثبوت تو خود ان کی حالت ہے۔ آخر بہن سے اتنا کہا کہ بڑے بھائی نے تم کو اس قدر ڈرا دھمکا دیا تھا۔ مگر تم نے نہ مانا اور دل کی بودی طبیعت کی کچی ہمت کی بیٹی تھیں تو ایسے کام پر تم کو جرأت کیونکر ہوئی بس اب تین پہر رات اور بے صبح ہوئی اور تمہاری ڈولی کو تو الی چلی۔ بھائی کے منہ سے اتنی بات سن غیرت بیگم کو اور تو کچھ نہ سوچا۔ بہت دن ہوئے تو لہ بھرا فیون منگوا کر صندوقے میں رکھ چھوڑی تھی۔ دوڑی کوٹھڑی میں جا صندوقچہ کھول افیون کا گولانگل۔ اوپر سے بھر کٹور پانی کا پی لیا۔ بتول کی انا کو یہ حال معلوم تھا کہ انہوں نے صندوقے میں افیون رکھ چھوڑی ہے۔ دالان کے ایک کونے میں بیٹھی ہوئی بھائی بہن کی باتیں سن رہی تھی، بیوی کو جو اس طرح گھبرا کر اندھیری کوٹھڑی میں جاتے ہوئے دیکھا جلدی سے بتول کو چار پائی پر لٹا پٹینتی ہوئی بھاگی۔ کہ اے ہے۔ خاک پڑے ایسے جنگڑے پر اب تو دشمنوں کو ٹھنڈک

پڑی وہ بیوی نے افیون کھائی۔ اتنے میں غیرت نیگم بھی کوٹھڑی سے کہتی ہوئی نکلی کہ بھائی تم کچھ تر دد مت کرو مجھ بری سے خدا نے تم سب کا پیچھا چھڑایا، صبح تک میں ہی نہیں رہوں گی کو تو ال کو اختیار بن میرا مرد لے جا کر کو تو الی میں دفن کرے۔ زہر خورانی کا ایک مقدمہ تو قائم تھا ہی اقدام خود کشی کا دوسرا اور ہوا۔ معصوم اور بتول دونوں کو گلے لگا کر ایسی بلک بلک کر روئی کہ گھر میں قیامت برپا ہو گئی۔ ناظر نے جو بہن کا بلبلانا دیکھا اور ساتھ ہی خیال آیا کہ بس یہ بھی دنیا میں تھوڑی دیر کی مہمان اور بنے پھر کہاں ہم اور کہاں بہن اس کے سر پر ایسا جنون سوار ہوا کہ نہ پکارا نہ کنڈی، کھڑکھڑائی نہ دستک دی نہ اجازت لی، منہ اٹھا سیدھا چھوٹے گھر میں جا گھسا، دونوں میاں بیوی سر جوڑے بیٹھے ہوئے خدا جانے کیا صلاحیں کر رہے تھے۔ بتانا نے آہٹ پا کر دور سے ڈانٹا اس یہ کیا بد تمیزی ہے، اندھے ہو تم کو معلوم نہیں کہ پردہ ہے۔ اس مرتبہ بہن کو مداخلت بے جا کی نالاش پر آمادہ کرتے تھے۔ اب یہ مداخلت بے جا نہیں ہے۔

ناظر: اللہ رے تیرا پردہ، نو سو چوبے کھا کے بلی جج کو چلی یہی نا لائق پردے والی بنی تو پردے والی نے افیون کھائی اور دنیا جہان سے روپوش ہونے کی تیاری کی۔

بتانا: الحمد للہ خس کم جہاں پاک۔ مگر تم خیریت سے چلتے پھرتے تو نظر آؤ سامنے سے پرے ہٹے ہو یا میں اٹھ کر تم کو رستہ دکھاؤ۔ بتانا کا اتنا کہنا تھا کہ ناظر یا تو صحن میں تھایا بتانا کی چھاتی پر پھرتو دونوں میں خوب کشتی ہوئی، ناظر دیہات میں پیدا ہوا۔ دیہات میں پاپا ہاتھ پاؤں کا ڈھلا گھٹیلایا برسوں اکھاڑے کا لڑا ہوا بیسیوں داؤ یا د پچاسوں گھاتیں معلوم، سینکڑوں پیچ رواں اور اب تک بھی دو وقت ڈنڈ مگر کبھی اس نے ناغہ ہونے نہیں دیئے۔ بتانا بے چارے نازنین میرے پھوپھو پھامرز امین ناظر نے وہ پنچیاں دیں اور ایسا رگڑا کہ آنکھیں نکل نکل پڑیں اور سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے۔ بتانا کے پاس ہتھیکہ تھی کچھت کل جمع تین حربے چٹکیاں لینا، نوچنا، کاٹنا، سوناظر کی پھرتی کے مقابلہ میں ایک بھی کارگر نہ ہوا۔ بتانا کو اگر معلوم ہوتا کہ یہ کم بخت چھوٹا کھوٹا چھپا رستم ایسے غضب کا بچھا ہوا ہے تو کبھی بھول کر بھی اس سے دو بدو نہ ہوتا مگر اس کی تقدیر میں تو دو بیبیاں کر کے ہر طرح کی مصیبت اٹھانی تھی چھوٹا سمجھ کر اس کو ایک ڈانٹ بتائی بیٹھے بٹھائے اور اپنی سعادت گنوائی ہریالی نے دیکھا کہ میاں کو ناظر گیند کی طرح اچھالے اچھالے پڑا پھرتا ہے۔ یہاں سے اٹھایا اور وہاں دے مارا۔ ادھر اے اچھا! ادھر! اچھا! ایسی دہشت دل میں سمائی کہ اس کا حمل جس کے سبب سے اتنا سارا فساد ہوا ساقط ہو گیا۔ ناظر کیا بتانا جیتا چھوڑتا وہ تو خدا کا کرنا میں وقت پر سید حاضر آ پہنچے دیکھا تو گھر میں مجموعہ تعزیرات ہند پھیلا پڑا ہے مگر کیا قائم مزاج آدمی تھا آتے کے ساتھ سب سے پہلے تو ناظر اور بتانا کو چھڑایا، پھر نمک ڈال بھر بھر لوٹے گرم پانی غیرت نیگم کو پانا شروع کیا۔ غیرت نیگم اس طرح کی ضدی عورت تھی کہ اگر ساری دنیا ایک طرف ہوتی تو گرم پانی کا کٹورا منہ کو نہ لگانے دیتی مگر



کچھ تو بڑے بھائی کا لحاظ اور ادھر چپکے سے کسی نے کان میں جھک کر کہہ دیا کہ مبارک ہو ہریالی کا حمل تو گر گیا۔ بے عذر خوب ڈگدگا کر پانی پی لیا۔ پانی کا حلق سے اترتا تھا کہ استغراغ ہوا اور استغراغ کے ساتھ کھٹ سے افیون کا گولا سموچے کا سموچا نکل کر الگ جا پڑا۔ ادھر ہریالی کی خدمت کے لیے دوہری دوہری دائیاں بلوائیں اور پھر بتلا اور ناظر دونوں کو ساتھ لے جا کر بیٹھا کہ ہر چند تم دونوں کی طبیعتیں اس وقت حاضر نہیں اور سچ تو یہ ہے کہ مزاج میرا بھی ٹھکانے نہیں مگر میں دیکھتا ہوں تو آدھی رات ڈھل چکی ہے۔ صرف سواپہر کی مہلت ہے۔ سامان تو بد قسمتی سے ایسا جمع ہوا ہے کہ اب آبرو بچتی ہوئی نظر نہیں آتی اور جب آبرو پر بنی تو سب سے پہلے شخص جو جان دینے میں دریغ نہ کرے میں ہوں دیکھو تو کتنے آدمی ہم لوگوں کے ملاقاتی ہیں مگر ہمدردی اور مدد تو درکنار مرد عورت کوئی آکر بھی جھانکا! سچ کہا ہے گاڑھی بھر آشنائی کام کی نہیں اور رتی بھرتا تا کام آتا ہے۔ بڑے سخت افسوس کی بات ہے کہ جب ناتے سے کام لینے کا وقت آیا تو تم لوگ آپس ہی میں لڑنے لگے جس طرح پر تم دونوں میں لڑائی شروع ہوئی۔ میں سب سن چکا ہوں تم میں سے کسی کو مجھ سے توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ میں ایک کو ملازم ٹھہراؤں اور دوسرے کو بری۔ جس طرح تالی ایک ہاتھ سے نہیں بچتی اسی طرح لڑائی کبھی ایک کے لڑنے سے نہیں لڑی جاتی۔ میں تم دونوں کو برابر الزام دیتا ہوں لیکن رشتہ داروں میں اگر کسی بات پر چچ بھی ہو جاتی ہے تاہم ان کے خون ملے ہوئے ہیں وہ ظاہر میں جدا ہیں اور باطن میں ایک۔ غیرت بیگم کا افیون کھا لینا سن کر بتلا بھائی کو منہ سے الحمد للہ کہہ دینا بہت آسان تھا لیکن جب غیرت بیگم کی مدت حیات پوری ہو اور خدا کرے کہ بتلا بھائی اس کو اپنے ہاتھوں سے مٹی دیں تو دنیا میں سب سے بڑھ کر رنج کرنے والے بھی یہی ہوں گے گھر کس کا برباد ہو گا ان کا۔ اولاد کس کی بے ماں کی ماری ماری پھرے گی، ان کی کنبے والوں کا میل ملاپ کس سے چھوٹ جائے گا، ان سے بھلے مانسوں میں جو خانہ داری کے ساتھ ہوتی ہے۔ یعنی تمدنی عزت وہ کہیں کی جاتی رہے گی ان کی۔ اس میں شک نہیں چھوٹی بھانج کی وجہ سے دلوں میں بڑے فرق پڑ گئے ہیں۔ اور پڑنے ضرور تھے مگر پھر بھی غیرت بیگم کی ناموس کا پاس ہم کو چھٹا نک بھرتو بتلا بھائی کو سیر بھر ہو گا۔ میں جانتا ہوں کہ بتلا بھائی بڑے ضبط کے آدمی ہیں۔ منہ سے نہیں کہتے مگر ان کے تلوؤں سے لگی ہے۔ ناظر کیا تم سے کوئی خیر کی توقع کرے گا۔ جب تم ایسی مصیبت میں بتلا بھائی کی مدد نہ کرو۔ ہزاروں مقدموں میں تم بہ طمع صلہ پیروی کرتے ہو اس ایک مقدمے میں صلہ رحم کو صلہ تجھو اور میری خاطر سے اپنی بہن کی خاطر سے بھانجے بھانجی کی خاطر سے غصے کو تھوک کر بچاؤ کی کوئی صورت نکالو اور تم بتلا بھائی! از برائے خدا رحم کرو، اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں پر بزرگوں کے نام پر خاندان کی عزت پر تم کو معاملات مقدمات کا کبھی اتفاق نہیں پڑا۔ کوتوالی والے مدت سے تم پر دانت لگائے ہیں۔ خدا جانے کس بلا میں تم کو پھنسا دیں گے۔ ناظر تمہارا خورد ہے۔ اگر اس نے بے تمیزی کی تو بہت برا کیا۔

جھک مارا میں اس کی طرف سے معذرت کرتا اور تمہاری ٹھوڑی میں ہاتھ ڈالتا ہوں۔ جانے دو معاف کرو۔ اس کے بعد ناظر کو پکڑ کر بتلا کے پیروں پر گر لیا اور ناظر اور بتلا دونوں کو گلے لگوا لیا۔ وہ دونوں بھی ایک دوسرے سے مل کر روئے۔ حاضر بہن کی تباہی کا تصور کر کے مغموم تو پہلے سے تھا اب ان کو روتا دیکھ کر آپ بھی رونے لگا۔ جب سب کے دلوں کی بھڑاس نکل چکی تو حاضر نے ناظر سے پوچھا کیوں بھائی اب کیا کرنا چاہیے؟

ناظر: خیر اب آپ فرماتے ہیں اور آپ کا قدم درمیان میں ہے تو میں اس مقدمہ میں ہاتھ ڈالتا ہوں مگر بتلا بھائی نے آج اس رٹڈی کے سامنے (آپ برامانیں یا بھلامانیں میں تو اس کو ساری عمر بھاونے کہنے والا نہیں) جیسا ذیل کیا ہے کہ میں اس رنج کو کبھی بھول نہیں سکتا۔ جب آپ نے میرے بیٹھے پر ایفون کھائی تو میں گھبرا کر اس غرض سے ان کے پاس دوڑا ہوا گیا تھا کہ ہم دونوں ہم صلاح ہو کر تدبیر کریں۔ انہوں نے مجھ کو دروازہ میں سے دیکھ کر اس طرح دھتکارا کہ کوئی کتے کو بھی نہیں دھتکارتا، مجھ کو رہ کر غصہ آتا ہے کہ انہوں نے تو شرم اور حیا سب کو بالائے طاق رکھ دیا۔ یا آپ کے سامنے میرا منہ کھلواتے ہیں۔ کل کی بات ہے کہ یہی نا افاق جو آج بڑا المہا چوڑا پردہ لگا کر بیٹھی ہے۔ (بے اختیار رچی چاہتا ہے کہ مارے جو تئیں کے بد ذات کے سر پر ایک بال باقی نہ رکھوں) نکلے نکلے پر ماری ماری پڑی پھرتی تھی اور کوئی اس پر تھوکتا بھی نہ تھا۔ ان ہی سے پوچھئے کہ کئی بار میرے یہاں اس کا مجرہ ہوا۔ جب آتی تھی ڈیوڑھی میں سے فرشی سلام یا اب اس کو یہ بھاگ لگے ہیں کہ ہمارے سامنے ہونے سے اس کی بے پردگی ہوتی ہے۔ عزت بنانے سے نہیں بنتی بلکہ خداداد چیز ہے۔ آج یہ پردہ نشیں بنی کل کو سیدانی بن کر چاہے گی کہ ہماری ماؤں بہنوں کے ساتھ بیوی کی صحت کھائے پرسوں اس کے بال بچے اور کہیں کہ سیدوں میں رشتہ ناتہ کرتی ہوں تو کوئی بھلامانس اس کو جائز رکھے گا! یہ جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں سب ہماری آپا کا صبر پڑ رہا ہے۔ اور بھی کیا ہے مظلمہ تو بتلا بھائی کو ایسے ناچ نچائے گا کہ ہریالی کو ساری عمر ایسا ناچ ناچنے کا اتفاق نہ ہوا ہوگا۔ ناظر تو باتوں باتوں میں گرم ہو جاتا تھا اور بتلا کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں کہ اب کے پھر کہیں یہ جن لپٹ پڑا تو ہڈی پسلی ایک کر کے رکھ دے گا۔ حاضر کے بیٹھنے کی اگر ڈھارس نہ ہو تو قریب تھا کہ بتلا کی گھگھکی بندھ جائے۔ بارے حاضر نے کہا بھائی ناظر یہ تم پھر بگاڑ کی سی باتیں کرتے ہو۔ یہ سوچ ہے کہ بتلا بھائی کی نادانی نے سارے گھر کو تہ و بالا کر دیا مگر یہ بھی تو نہیں ہو سکتا کہ ہم غیروں کی طرح دو رکھڑے ہوئے تماشا دیکھیں۔

ناظر: یہ تو میں نے وہ حقیقت بیان کی جو میرے دل میں تھی رو گیا مقدمہ اس سے آپ اطمینان رکھئے، بتلا بھائی کو روپیہ تو بہت خرچ کرنا پڑے گا۔ ایسا کوئی پانچ چھ ہزار مگر خدا نے چاہا تو ان پر اور ان کے طفیل میں ہریالی پر کوئی گزند نہیں آنے پائے گا۔

اس وقت تک بتانا کو مقدمہ کی واقعی روداد اور کوٹوالی کی تحقیقات سے اپنی اور ہریالی دونوں کی طرف سے پورا اطمینان تھا اور دونوں اپنی جگہ خوش تھے کہ چاہ کن را چاہ در پیش۔ سکھیا اسی غرض سے ہم دونوں کھائیں اور مر کر رہ جائیں۔ خدا کی قدرت ہم دونوں کے منہ پر رکھنے کی نوبت بھی نہیں آئی۔ اور اوپر ہی اوپر ماما کے بیٹے نے جاسر کار میں خبر پہنچائی۔ اب لینے کے دینے پڑے۔ غیرت بیگم کو پھانسی ہو تو پھانسی، عمر قید میں تو شک ہی نہیں، چلوستے چھوٹے اور روز کاٹنا مٹا۔ ناظر کے منہ سے یہ کام سن کر کہ پانچ چھ ہزار روپیہ خرچ کرو تو تم پر گزند نہیں آنے پائے گا۔ بتانا تو حیران ہو کر اس کام نہ دیکھنے لگا اور بے اختیار بول اٹھا کیوں صاحب! الٹا چور کوٹوال کو ڈانٹے مجھی کوز ہر دیا جائے اور میں ہی گزند سے بچنے کے لیے پانچ چھ ہزار روپیہ بھی خرچ کروں کیا انگریز کی عمل داری میں یہی انصاف ہے۔

ناظر: ہوش کی بناؤ، تماش بینی اور شے ہے اور مقدمہ کی باریکی کو پہنچنا کچھ اور چیز ہے۔ تم کو اتنا معلوم ہی نہیں کہ معاملہ کس کو کہتے اور مقدمہ کس جانور کا نام ہے۔ میں تو زبان دے چکا ہوں اور بد عہدی کسی شریف آدمی کا کام نہیں اس لیے چند تہہ کی باتیں تم کو سمجھاتا ہوں کوٹوالی کی تحقیقات کو تو عدالت میں کوئی پوچھتا تک نہیں روداد وہی معتبر ہے جو عدالت کی مثل میں ہو کیا تم نے نہیں دیکھا کہ کوٹوالی کے لوگ زبانی پوچھ گچھ کے سوا کسی کا اظہار تک قلم بند کرنے نہیں سکتے۔ اصل بات یہ ہے کہ پہلے کوٹوالی اور فوجداری ایک تھی جب یہ لوگ لگے اظہار کارگزاری کے لیے ہر واردات بے سراغ کے لیے مجرم بنانے اور اصل مجرموں سے سازش کر کے بے گناہوں کو ناحق پھنسانے تو سرکار نے کوٹوالی اور فوجداری کو الگ کر دیا۔ اب تو کوٹوالی والوں کا اتنا ہی اختیار ہے کہ جس کو اپنے نزدیک مجرم سمجھیں حاکم عدالت کے پاس چالان کر دیں۔ حاکم عدالت مدعی اور مدعا علیہ گواہوں کے اظہار قلم بند کرتا ہے اور اپنے یہاں کی روداد پر سزا یا رہا کرتا ہے۔ کوٹوالی والے اپنا پ شناپ جس کو پکڑ کر پاتے ہیں چالان کر دیتے ہیں عدالت میں گئے اور رہا ہوئے اور ہمارے صاحب مجسٹریٹ کوٹوالی سے اس قدر بدظن ہیں کہ مجسٹریٹ کا اجلاس کرتے ہوئے پورا برس نہیں اتنے ہی دنوں میں کوٹوالی والوں سے جیل خانہ بھر دیا۔ غرض کوٹوال اور ان کی تحقیقات کی تو کچھ بھی حقیقت نہیں۔ اب روگئی مقدمے کی روداد سو اس کا یہ سوال ہے کہ سکھیا حقیقت میں پکڑی گئی ہریالی کے یہاں، پس مدعا علیہ اول ہوئی ہریالی اور پہلے اسی پر اشتباہ کیا جائے گا کہ اسی نے فرنی میں ڈالی یا ڈالوائی۔

بتانا: بھلا وہ کم بخت بد نصیب کس کو سکھیا دینے اٹھی تھی اپنے تین یا مجھ کو یا اپنی ماما کو جو سال ہا سال سے نوکر ہے اور کبھی اس کو پھٹے منہ تک نہیں کہا یا اپنے پالے ہوئے جانوروں کی تو بات الگ ہے لیکن دوسرے احتمالات میں تو کوئی استبعاد کی بات نہیں ہے۔

ناظر: ہو سکتا ہے کہ اس نے زہر دینا چاہا ہو تو عجب نہیں بازاری خلقت کا بھروسہ کیا خدا جانے اس نے کیا سمجھ کر تم سے نکاح پڑھوایا اور اب جو اس کی مراد بر نہ آئی تو اس نے اپنا پنڈ چھڑانے کے لیے یہ تدبیر کی۔ اگر وہ اپنی حالت سابقہ پر عود کرنے کی آرزو مند ہو تو اس سے کچھ دور نہیں۔ ماما تم خود کہتے ہو کہ اس کے پاس مدت سے بے تو ضرور اس کے پچھلے حالات سے بخوبی واقف ہوگی اور عداوت کے لیے اتنی بات کافی ہے اور سکھیا کے لیے تمہاری اور ہریالی ماما کی کیا تخصیص ہے۔ ’معصوم‘ مارے مارے دن ہریالی کے یہاں رہتا ہے وہ یقیناً اس کی جان کی دشمن ہے۔ ان کے ملاوہ احتمال اور بے اور وہ سب میں زیادہ ترین قیاس ہے کہ آپا کے پھنسانے کے لیے یہ سارا منصوبہ سوچا گیا ہے ورنہ سبب کیا کہ جانوروں تک فرنی کھلائے اور آپ منہ تک نہ لے جائے۔ اور بدذات نے کیا چالاکی اور بے رحمی کی ہے کہ بے زیادہ جانوروں کو تو اتنی فرنی ٹھسائی کہ ایک نہ بچا ہوگا شہیدوں میں داخل کیا۔ گھوسن کی گواہی پر کچھ لحاظ نہ ہوگا؟

کیا معلوم کہ عدالت تک پہنچتے پہنچتے گھوسن اپنے بیان پر قائم بھی رہتی ہے یا نہیں اور فرض کرو قائم رہے تو اس نے سکھیا کا نام تک بھی نہیں لیا بلکہ میری نظر سے دیکھو تو گھوسن کا بیان ہریالی کے حق میں سم تاتل ہے، وہ کہتی ہے کہ خاتون نے مجھ کو دودھ کی ہنڈیا واپس کر دی۔ بہت خوب۔ ہریالی نے جب یہ سن لیا تھا کہ بڑے گھر سے دودھ برا سمجھ کر واپس کیا گیا تو اس نے چپ چاپ تہ ضرورت سے زیادہ بھری کی بھری ہنڈیا رکھ کیوں لی۔ بس یہیں تو پانی مرتا ہے اس سے صاف شبہ ہوتا ہے کہ ہریالی نے گھوسن سے مل کر اس کے گھر دودھ میں سکھیا گھلوائی اور جب خاتون دھوکے میں آئی تو دوسری چال چلی اور پھر یہ بھی سمجھو کہ ہریالی اور تم دونیں ہو، ہریالی کا کرنا عین تمہارا کرنا ہے اور ابھی خاتون کے بیان کی تو نوبت آنے دودھ کو تو وہ کیا زہرا گلتی ہے۔ کوئی والی والوں کی کارروائی میں فی الواقع ہمیشہ ایک بڑا نقص یہ ہوتا ہے کہ تحقیقات سے پہلے مقدمہ کو کسی ایک پہلو پر ڈھال لے جاتے ہیں اور پھر اسرار خیر تک اسی پہلو کی تائید میں لگے رہتے ہیں جو باتیں میں نے تم سے سرسری طور پر بیان کی ہیں ان میں سے ایک کی طرف بھی کوئی مال صاحب کا ذہن منتقل نہ ہوا ہوگا اور ہم لوگوں کو تو باتیں حاکم کی میز پر جو جھتی ہیں، عین وقت پر کچھ اس طرح کا بہرہ کھل جاتا ہے کہ خود بخوبی بات میں سے بات نکلی چلی آتی ہے۔ بتانا کی ساری ہمت تمام عمر ہی مصروف حسن و عشق میں مدعی اور مدعا علیہ بننا درکنار اور اس کو کبھی گواہی دینے کا بھی اتفاق نہیں پڑا۔ بچپن کا لاڈلا جوانی کا چھیلا وہ دو کیلوں کے چہل فریب کیا سمجھے، ناظر نے جو الٹی سیدھی باتیں سمجھائیں چھکے ہی تو چھوٹ گئے اور سمجھا کہ بس اب نہیں بپتا، سکھیا کا غصہ ہریالی کا رنج اپنی چوٹ۔ اگلے پچھلے گلے شکوے سب کچھ بھلا بھرا ناظر کے گلے سے لپٹ گیا کہ بس اب اوپر خدا ہے اور نیچے تم۔ چاہو مارو، چاہو جلاؤ، چاہو جاڑو، چاہو بھاؤ۔

ناظر: مقدمہ تو میری طرف آ گیا ہو اور سمجھو کہ مقدمہ کا میں بیمہ لے چکا خرق کا بند و بست تم کرو۔

بتا: خرق کا بند و بست بھی تم ہی کو کرنا پڑے گا تم کو تو ہر گھر کا ذرا حال معلوم ہے۔

ناظر: کیا مضا لفقہ خرق کا بھی انتظام ہو جائے گا۔

بتا: کوڑی کوڑی۔

ناظر: خیر آپ دور فتنے میرے نام لکھتے ایک تو کل کی تاریخ میں کہ چوبیس کی جیسی کثرت ہے تم کو معلوم ہے اب تو یہ نوبت پہنچتی ہے کہ کھونیوں پر لٹکے ہوئے کپڑے کاٹ کاٹ کر ٹکڑے کئے ڈالتے ہیں، ناچار تھوڑی سکھیا منگوائی پڑیا چھوٹے گھر کے بچے والے دالان میں اس خیال سے کہ کسی کا ہاتھ نہ پڑے اونچے پر رکھوائی تھی یہ ذکر کوئی سات یا آٹھ دن پہلے کا ہے کل کیا اتفاق ہوا کہ شام کے وقت ایک روپے کی کھانڈ کا پٹا آیا اور جیسا دستور ہے پٹے کے ساتھ نمونے کی پڑیا۔ سکھیا کا تو خیال نہ تھا۔ کھانڈ کا پڑا اور پڑیا دونوں کو اس طاق میں رکھوا دیا جس میں سکھیا کی پڑیا تھی۔ آج خود گھر والی نے اپنے ہاتھ سے فرنی میں کھانڈ ڈالی تو انہوں نے کہا پڑیا کی کھانڈ بھی کیوں ضائع ہو پڑا اور پڑیا دونوں اتارتی لائیں مگر پڑیا سکھیا کی باورچی خانے میں بھی دھوئیں کی وجہ سے کچھ دکھائی نہ دیا اور چونکہ دل میں کسی طرح کا کھٹکا نہ تھا۔ انہوں نے دیکھا بھی نہیں فرنی پک کر تیار ہو گئی تو تھوڑی جانوروں کو دی جو گھر والی نے اپنے شوق کے لیے پال رکھے تھے اور جو دیگچی میں رہ گئی تھی ماما نے پونچھ کھائی۔ جانور تو مر گئے ماما کو کچھ دست آئے مگر بچ گئی کوٹوالی کے اوگ مقدمہ کو طول دینا چاہتے ہیں تم مختار کارانہ اس کی خبر گیری کرو اور دوسرا رقعہ اب سے مہینے سوا مہینے جتنے دن پہلے کا چاہو لکھ دو کہ مجھ کو اتنے روپے کی ضرورت ہے جہاں سے بن پڑے بند و بست کر دو۔ بس اللہ اللہ خیر صلا اور چین سے پیر پھیلا کر سو رہو۔ سکھیا کے رقعے کا مضمون سن کر تو بتا: کی عقل دنگ رہ گئی اور سمجھا کہ ناظر بھی بڑا زہر کا بھجا ہوا ہے۔ دیکھو تو مغز سے بات اتاری ہے۔ ایسے شخص سے پار لے جا سکتا ہوں۔ میرا بچا تو اتنی میں ہے کہ جو یہ کہے اس میں ذرا کان نہ ہلاؤں غرض اسی وقت دونوں رقعے لکھ ناظر کے ہاتھ دیئے اور پوچھا کہ بھلا صاحب اب صبح کو تو ال صاحب آئیں تو کیا کرنا ہوگا؟ ناظر نے کہا اب بندہ درگاہ کے رہتے کو تو ال صاحب کیا آتے ہیں؟ اب آمد تیمم بر خاست اور اگر آئے بھی تو کو تو ال بن کر نہیں بندہ حال بد حال سراپا اٹھتا ہاں۔

بتا: اور کیوں صاحب جیسا اس کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا اگر اس نے انگریز کو جو کوٹوالی کا فسر ہے لاکھڑا کیا؟

ناظر: اوہم سگ زرد و در شغال۔ باوجودیکہ ابھی جبٹ پٹا تھا ناظر فوراً سوار ہو سیدھا کوٹوال کے پاس پہنچا، کوٹوال سمجھا کہ ایسے وقت آئے ہیں تو معلوم ہوتا ہے ضرور کچھ نہ کچھ بوئنی کرانیں گے۔ دور سے ہنس کر بولا آئیے آج تو سویرے ہی سویرے اچھے بختی کے درشن ہوئے۔ میں تو آپ کے یہاں آنے کو وردی پہن کر تیار لیس بیٹھا ہوں۔ صاحب

سپرٹنڈنٹ سے سات بجے کا وعدہ ہے۔

ناظر: کیا تیار بیٹھے ہو وہاں تو رات بڑا غضب ہو گیا۔

کوٹوال: کیا کوئی اور صاحب سٹکھیا کھا کر شہید ہوئے۔

ناظر: نہیں سٹکھیا نہیں مگر آپ تو جانتے ہیں بتانا بھائی کے گھر میں جو وہ دوسری عورت ہے پورے دنوں سے تھی کل نہیں معلوم آپ کے سپاہیوں نے اس کو کیا کیا ڈرایا دھمکایا طبیعت تو اس کی آپ کے رہتے ہی بگڑ چلی تھی آپ ادھر آئے شاید کوٹوالی بھی نہ پہنچ سکے ہوں گے کہ اس کا حمل ساقط ہو گیا۔ ساری رات اسی کے تردد میں پلک نہ جھپکی۔ خیر حمل تو حاصل اب اس کی جان کے الے پڑے ہیں۔ دیکھئے وہ بھی بچتی ہے یا نہیں۔ بتانا بھائی کو اس عورت کے ساتھ اس درجہ کا عشق ہے کہ جس وقت سے یہ واردات ہوئی ہے۔ سارے گھر میں بولائے بولائے پڑے پھر رہے ہیں وہ تو ڈاکٹر جینیالی کو بلاتے تھے۔ میں نے بہ ہزار مشکل روکا کہ انگریزوں کے کان پڑی ہوئی بات پھر اپنے قابو کی نہیں رہتی۔ ایک چھوڑ دودو دایاں بلوادی ہیں بارے اب کہیں جا کر کسی قدر طبیعت سنبھلی تو میں آپ کے پاس بھاگا ہوا آیا۔ میں تو رقعہ لکھنے کو تھا پھر خیال آیا کہ خدا جانے کس کے ہاتھ پڑے۔ آپ چل کر کہنا چاہیے۔

یہ کہنا تھا کہ کوٹوال کو کاٹو تو بدن میں لہو کی بوند نہیں۔ گڑ گڑا کر بولا آپ کے یہاں ہم تابعداروں کی مجال ہے کہ ڈرائیں دھمکائیں یا کوئی خلاف قاعدہ کارروائی کریں۔ آپ جس وقت تشریف لائے ہیں آپ نے بھی دیکھا ہو گا کہ مردانے میں صرف دو ہی کانشیبل میرے ساتھ تھے اور وہ دونوں بے چارے الگ اصطبل کے پاس کھڑے تھے۔ میں نے آپ کے آدمی وفادار کے ہاتھ ماماؤں اور لونڈیوں کو بلایا کر ہو لے سے دودو باتیں پوچھ لیں۔ اصل حقیقت تو یہ ہے اور ہم نے تو جس دن پولیس میں نام لکھوایا اسی دن سمجھ لیا تھا کہ ایک نہ ایک دن ضرور قید ہوں گے یہ ایسی تہیسی نوکری ہی اس قسم کی ہے کوٹوالوں کی دکانداری کہ بے کالا منہ ہوئے نہیں رہتا۔ بڑوں کا کہا اور آنولے کا کھایا پیچھے مزد دیتا ہے۔ اللہ جی نے بہتیرا سر پکڑتے رہے کہ ہم لوگ ٹھہرے لکھنے چند ہم کو سپاہیوں کا بھیس سزاوار نہیں۔ ہر کارے و ہر مردے اس وقت ان کی بات کچھ دھیان میں نہ آئی سوا اپنے کئے کی سزا پائی۔

ناظر: یہ میں خوب جانتا ہوں کہ آپ نے بے جا کارروائی نہیں کی ہوگی۔ آدمی کا حال چھپا نہیں رہتا۔ سارا شہر آپ کا مداح ہے۔ اور اگر آپ احتیاط نہ کرتے تو اتنے کو کوٹوالی کا چہنا بھی محال تھا خصوصاً صاحب بمسٹر میٹ حال کے وقت میں مگر عورتیں تو جیسی ڈرپوک اور کچے دل کی ہوتی ہیں آپ خوب جانتے ہیں۔ آپ کا ہی آنا سن کر ان کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے ہوں گے اور پھر کسی سپاہی نے کوئی ایک آدھ بات بھی کہہ دی ہوگی، حالت تو تازک تھی ہی اوگھٹنے کو بھیتے کا بہانہ

ہو گیا۔ چھوٹے گھر میں تو خیر ایک واردات بھی ہوئی تھی کہ جانور مرے، ماما کو دست آئے، فرائی میں سنگھیا نکلی۔ بڑا گھر جس کو واردات سے کچھ بھی تعلق نہیں، وہاں کیا حال تھا۔ جا کر دیکھتا ہوں تو چوہا تک نہیں ساگا۔ وہ تو جب میں سمجھا کہ یہ کیا اس سے بڑی بڑی اتفاقی اور ناگہانی وارداتیں ہو جاتی ہیں، اور آخر کار مقدمہ داخل دفتر، تب سب کو تسلی ہوئی۔

کوٹوال: اتفاقی کیسی!

تب ناظر نے بتایا کہ رقعہ دیا کہ وہ خونِ دروازے میں جو ایک شخص نے اپنی آشنا کو دستورہ کھلا کر مار ڈالا تھا اور شاید آپ ہی نے اس مقدمہ کی بھی تحقیقات کی تھی کل اس کی پیشی تھی اور میں مدعا علیہ کا وکیل تھا۔ آپ کے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ بھی سرکار کی طرف سے پیروی کے لیے موجود تھے۔ بڑے بڑے مباحثے رہے آخر ساڑھے چار بجتے بجتے مدعا علیہ کی رہائی ہوئی ہاں تو یہ رقعہ مجھ کو عین اجاس پر ملا تھا اور اس کو دیکھ کر میں کچھری سے سیدھا وہیں چلا گیا۔ کوٹوال نے رقعہ پڑھا تو مقدمہ کی طرف سے بھی اس کی آس ٹوٹ گئی۔ کمر سے کرچ کھول ناظر کے پیروں میں رکھ دی کہ نوکری تو یہ حاضر بنے خدا واسطے کو ایک اننا سلوک کیجئے کہ عزت پر ہاتھ نہ ڈالئے۔ ناظر نے بہت تسلی کی کہ بھلا اتنا تو سمجھئے کہ اگر میرے دل میں کچھ فساد ہوتا تو میں اس سویرے اندھیرے منہ آپ کے پاس دوڑا ہوا کیوں آتا۔ خیر جو کچھ ہوتا تھا سو ہوا۔ میں جس طرح بن پڑے گا، بتایا بھائی کو سمجھا لوں گا۔ جب سے انہوں نے دوسری عورت کر لی بنے ذرا تنگ دست رہتے ہیں یہی نہ کہ دو اور رہن کا خرچ اور اوپر سے سو دو سو روپیہ اور ان کو دے دیا جائے گا اور ہاں سنگھیا کے مقدمے میں آپ ان کو کچھ زیادہ چھیڑ چھاڑ نہ کیجئے گا۔ اس میں کچھ ہوتا ہوتا بھی نہیں۔ ناظر چلنے لگا تو کوٹوال نے کہا پھر اس کرچ کو تو آپ اپنے ہاتھ سے باندھ دیں گے تو میں کمر سے لگاؤں گا ورنہ جہاں پڑی بنے پڑی رہے گی۔ ناظر نے جلدی سے کرچ اٹھا، بسم اللہ کر کے کوٹوال کی کمر سے باندھی گویا اپنی طرف سے کوٹوالی دی۔ کوٹوال نے کہا بس اب ہاتھ پکڑنے کی لائن آپ کو کرنی ہوگی۔ صاحب سپرنٹنڈنٹ کو وہاں ایک اور ضرورت پیش آ گئی کہ کسی انگریز کے یہاں سوڈا واٹر کی ایک دو بھی نہیں، اکٹھی آدھی درجن بوتلیں چوری ہو گئیں۔ صاحب نے چٹھی لکھی اور سپرنٹنڈنٹ صاحب اس کی تحقیقات کو بھاگے گئے کوٹوالی سے کہا! بیجا ہمارا آنا نہیں ہو سکتا پھر کوئی پندرہ بیس دن بعد خود سپرنٹنڈنٹ صاحب ہی کو خیال آیا تو پوچھا کیوں کوٹوال صاحب وہ کسی وکیل صاحب کے یہاں کی زہر خورانی کا آپ نے تذکرہ کیا تھا اس کا کیا ہوا۔ کوٹوال نے کہا حضور فردوی نے تو اگلے ہی دن ۳۰۲۲ نمبر کا روزنامہ چھپچھپ دیا تھا کہ واردات اتفاقی بنے بات رفت و گزشت ہوئی۔

دو چار دن تو بتایا کوکھٹکار ہا پھر اس نے دیکھا کہ کوٹوالی والوں میں سے کسی نے آ کر بھی نہ جھانکا تو اس کو یقین ہوا کہ ناظر کو حکام کے مزاج میں کچھ اس طرح کا درخور ہے، کہ آج جو چاہے سو کر گزرے۔

ناظر نے اس مقدمے میں اچھی بردباری کی ہزار روپے تو چپکے سے اس نے وہ اگلوائے جو خاتون کلنی غیرت بیگم کو بہکا پھسلا کر لے اڑی تھی اور رقتے کے بدلے بتانا سے اس کے حصے کی دکانوں کا قطعی بیع نامہ اپنے نام لکھوا لیا اور پھر سب میں سرخرو۔ اب بیچارے بتانا کے پاس پیسٹھ روپے ماہوار کی جگہ صرف ستائیس روپے مہینے کی نری تنخواہیں رہ گئیں۔ وہ کس طرح کی کہ کوئی چھٹے مہینے آدھی پاؤ وصول ہوئی تو کوئی برس بعد اور کوئی مار میں بھی آگئی اور غیرت بیگم کی یہ تاکید کہ بھلا کوئی ایک لونا پانی تو اس کے گھر میں سے بتانا کو دے دیکھے، غیرت بیگم کے یہاں پہلے ہی بتانا کی کون سی قدر کی جاتی تھی، اب جس دن سے یہ معاملے مقدمے کھڑے ہوئے رہا سہا اور بھی نظروں سے گر گیا۔ پہلے بے رخی تھی۔ رفتہ رفتہ بد مزاجی ہوئی۔ بد مزاجی سے بددماغی کی نوبت پہنچ گئی بلکہ طرز مدارات سے ایسا مستبد ہونے لگا کہ سید حاضر نے جو ایک دن سچ کے آنے کا معمول باندھ دیا تھا۔ اب بتانا کو اتنا آنا بھی گوارا نہیں۔ غیرت بیگم کو بتانا سے بات چیت کئے ہوئے برسوں گزر گئے تھے، لونڈیاں ماماں میاں کا اتنا لحاظ کرتی تھیں کہ باری کے دن کچھ تو صاف کر دیا۔ جب تک گھر میں بیٹھے حلقے کی خبر رکھی کھانے کو پوچھ لیا اور اب مقدموں کے بعد سے تو ان باتوں میں بھی مضائقہ ہونے لگا۔ بتانا اکھ گیا گزرا تھا مگر آخر تھا تو صاحب خانہ، یہ بے وقریٰ دیکھ کر وہ بڑے گھر کی باری کو تپ لرزدہ کی باری سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ مگر حاضر ناظر سے اس قدر رڈرتا تھا جیسے مرد و نکیرین سے ناخواستہ دل آتا اور برخاستہ خاطر رہتا۔ ایسی ایسی سنگین وارداتیں گھر میں ہو جاتیں اور کسی کی نکیر تک نہ پھونے، غیرت بیگم اور بھی بے محابا ہو کر لگی بادل کی طرح گر بنے اور بجلی کی طرح کڑکنے۔ سقہ اور دھوبی اور حال خور و غیرہ جتنے اہل خدمت تھے۔ ان تک کی بندی ہو گئی کہ چھوٹے گھر کا کام نہ کرنے پائیں۔ ناچار گلی کی طرف کا قدیم دروازہ جو مدتوں سے بند تھا۔ تیغ توڑ کر کھولا تب کام چلا۔



## بتالا اور ہریالی کا بگاڑ

جب تک باتوں کا زبانی جمع و خرچ رہا کہ غیرت نیگم نے اپنے گھر میں کس کاٹ لیا اور ہریالی نے اپنی جگہ پکار پکار کر نہیں تو چپکے سے جو کچھ منہ میں آیا کہہ دیا تب تک اگر سچ پوچھو تو ہریالی کی جیت تھی کیونکہ بتالا اس کے پلے پر تھا اور آمدنی کے حساب سے دونوں گھر برابر برابر اب جو پنسٹھ کے رو گئے ستائیس تو اس کا ایمان ڈگمگا چلا اور بتالا سے ادھر اکیلے گھر میں ساٹھ اور ادھر مردانہ زمانہ دو گھروں میں پنسٹھ گلوڑا پانچ روپے کا بل خدا جانے میں کیا کتر بیونت کرتی تھی کہ خیر گزر رہوتی چلی گئی۔

ہریالی: تم اپنے ہاتھ میں خرچ رکھتے ہوتے تو حقیقت کھلتی اور تمہارے بڑے گھر میں جاتی نہیں تو آخر سنی تو ہوں کہ آدمیوں کو ابالی دال ملتی ہے اور وہ بھی ایک وقت بچوں کا سودا سلف تو درکنار کبھی آدھی کے چنے لے کر دینے نصیب۔۔۔ نہیں ہوئے۔ اب تم نے پنسٹھ کے ستائیس کرائے ہیں تو تم ہی خرچ کا انتظام بھی کرو میں کوئی اپنی بوٹیاں کاٹ کاٹ تو کھلانے سے رہی۔

بتالا: ”پنسٹھ کے ستائیس میں نے کرائے ہیں۔“

ہریالی: جانے بلا تم نے کرائے ہیں یا انہوں نے جو تمہارے کچھ لگتے ہیں۔  
بتالا: تم ہی نے فرنی پکا کر بیٹھے بٹھائے سارا فساد برپا کیا اور الٹا مجھ کو اٹا ہنادیتی ہو۔  
ہریالی: مجھے خبر تھی کہ دشمنوں نے دودھ میں سٹکھیا گھول کر میری جان لینے کا سامان کیا ہے۔  
بتالا: اسی کا تو پتہ نہ چل سکا کہ کس نے دودھ میں سٹکھیا گھولی۔

ہریالی: تو کیا میں نے گھولی۔  
بتالا: تم نے گھولی تو نہیں مگر تم پر تھپ گئی۔  
ہریالی: تم نے تھپوائی تو تھپی۔

بتالا: ایک نہ شود دو شود۔ مہینہ میں نے کم کرایا۔ سٹکھیا کا الزام میں نے تم پر لگایا۔ میں ہی برا ہوں تو خدا برے کو موت دے۔  
ہریالی: خدا نہ کرے تم کیوں برے ہونے لگے بری میں کہ تمہارے کارن گھر چھوڑا آرام چھوڑا اس کا یہ انعام ملا کہ تمہارے یہاں آ کر کوسنے سے گالیاں کھائیں اور بے عزتی کا کوئی درجہ باقی نہ رہا۔ دودھ جان کا خطرہ اٹھایا۔

بتا: تم کو معلوم تھا کہ میرے بیوی بچے ہیں، پھر نہ آئی ہوئی۔ کسی نے زبردستی کی تھی اور اب تمہارے جی چاہے تو اب چلی جاؤ۔ تم سے کسی نے کچھ چھین تو نہیں لیا۔

ہریالی: ہاں ہاں میں کیا کرتی ہوں میں تمہاری بی بی کو جانتی تھی اور بچوں کا ہونا بھی معلوم تھا مگر مجھے خبر نہیں تھی کہ تم اس طرح کے خیر ہو کہ تاظر کی صورت دیکھنے سے تمہارے ہوش باختہ ہوتے ہیں اور میں اگر جاؤں گی اور جاؤں گی نہیں تو کیا مفت میں اپنی جان گنواؤں گی تو تاظر کو جو وکالت کے گمنڈ میں بہت اکڑا ہوا پڑا پھرتا ہے اور اس مکار حاضر کو جو ہر مرتبہ بڑا مولوی بن کر وعظ کہنے کو آ بیٹھتا ہے اور تیری بھینا کو تو ال کی جو رو کو اس موئے کو تو ال کو جس نے رشوتیں لے لے کر خون کے مقدموں کو ملیا میٹ کیا ہے اور سب کے ساتھ تجھ کو دنیا جہان میں الم نشرح کر کے جاؤں گی۔ میرا جانا کیا ایسی ہنسی ٹھٹھا ہے، میں نے تیرے پیچھے اپنے تین خاک میں ملا دیا اور آج تو نے اس کا یہ پھل دیا۔ اب دیکھ میرا تماشا تیرا تو کیا منہ ہے مگر باا اپنے حملاتیوں کو کہ مجھے جانتی کو روکیں یہ کہہ کر ہریالی کھڑی ہو سیدھی دروازے کی طرف چلی بارے بتاتا نے۔ ساری عمر میں ایک یہ بہادری تو کی کہ اس کو کوٹھڑی میں دھکیل جھٹ اوپر سے کنڈی لگا دی۔ ایں کاراز تو آید و مرداں چنیں کنند۔ بتاتا تو ہریالی کو کوٹھڑی میں بند کر کے باہر چلا گیا۔ ہریالی کے پاس جو پرانی ماما تھی وہ تھی ایک طرح کی اس کی کٹنی، اس نے ہریالی کو سمجھایا۔ بی بی مرد کا مزاج دیکھ کر بات کی جاتی ہے۔ اس کم بخت پر تو آپ ہی مصیبتیں پڑی ٹوٹ رہی ہیں تم اور چلیں گھاؤ میں اوپر سے مرچیں لگانے تھوڑے دن صبر کیا ہوتا وہ اپنے تین بیچتا چوری کرتا کہیں نہ کہیں سے تمہارا بھرتا بھرتا اور اگر تمہاری مرضی جانے کی ہوگی تو اس کی سوراہیں۔ ڈھونڈو را پیٹنا اور ڈھول بجانا کیا ضرور ہے۔ ادھر پان کے بہانے بتاتا کے پاس گئی اور اس سے کہا میاں برا کہو فیضی سختی کرو سب تم کو پہنچتا ہے، پر منہ بھر کر یہ کہہ بیٹھنا کہ چلی جاتم ہی انصاف کرو بڑی سخت بات ہے، خیر غصہ حرام ہوتا ہے۔ میاں بی بی کی لڑائی کیا اور میاں بی بی بھی تم جیسے کہ دو تمہاری عاشق زار اور تم اس پر دل و جان سے نثار۔ اٹھو گھر میں چلو۔ بیوی کی بھی روتے روتے ہچکی بندھ گئی تھی۔ اب میں نے اٹھا کر زبردستی پانی پلایا ہے۔

## بتا کی خانہ داری دونوں بیبیوں کے ساتھ کس طرح پر تھی

بتا اور ہریالی کی یہ لڑائی تو خیر ایک اتفاقی بات تھی مگر دیکھنا چاہیے ان میں باہمی ارتباط کس درجے کا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے سمجھنے میں غلطی کی۔ ہریالی نے سمجھا تھا کہ یہ آدمی بے حسن پرست بیوی اس کو بھائی نہیں اور مجھ پر ہورہا ہے۔ میں گئی نہیں اور اس کی بیوی سے تڑاچہڑا اپنے کھونٹے سے باندھائیں۔ یہاں آ کر دیکھا تو بیوی کو میاں کا خصم پایا کہ وہ اس کو اس طرح لپیٹ رہے تھے جیسے مکھی کو شہد۔ یہ بہتری کی کوشش کرتا ہے کہ اس سے چھوٹ جاؤں مگر اور تھڑتا چلا جاتا ہے، چاہیے تھا کہ مجبور سمجھ کر معذور رکھے۔ خود غرضی جبر و اختیار میں فرق کرنے نہیں دیتی تھی وہ کچھ کر نہیں سکتا تھا اور یہ جانتی تھی کہ اپنے پیٹے پن سے خود نہیں کرتا۔ وہ داری اور قربان تھی جب تک توقع میں جان تھی تا امید کی کا پیدا ہونا تھا کہ ساتھ رہنے سے اکھڑ گئی۔ بتا تو اول دن سے حسن صورت کے پیچھے ایسا فریفتہ تھا کہ خوب صورتی کے آگے حسب نسب، سلیقہ، ہنر، عقل، نیکی، دینداری کسی چیز کو دیکھتا ہی نہ سنا بیوی سے تھی اس کو نفرت چوٹوں کی طرح دو چار بار رات کو ہریالی کے یہاں گیا آنکھوں میں کھپ گئی۔ نہ انجام سوچا نہ عاقبت کا پر نظر کی گھر میں لا بٹھایا۔ بتا کے دل کو جو اچھی طرح سے ٹول کر دیکھا تو گھر میں آگے پیچھے ہریالی کی طرف اس کا اگلا سارخ نہ تھا اول تو اس نے ہریالی کے جانچنے اور آنکھنے ہی میں غلطی کی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ہریالی خوب صورت تھی مگر نہ اس درجہ کی کہ بتا جیسا حسین آدمی اس پر منتوں ہو۔ یونیورسٹی کی ڈگریاں اگر خوب صورتوں کو ملتی ہوتیں تو ہریالی ہماری بس ایف اے کے قابل تھی مگر بتا تو اس کو نکاح سے پہلے ایم۔ اے کے درجے سمجھتا تھا۔ دوسری ایک وجہ یہ ہوئی کہ ہریالی کو ویسا بناؤ سنگار نہ تو اب میسر تھا اور نہ اس کا موقع تھا اور سب سے بڑا سبب تو ہمارے سمجھنے کو یہ تھا کہ کیسی ہی کوئی نعمت کیوں نہ ہو۔ اس کی قدر طلب تک رہتی ہے۔ حاصل ہوئی اور اس کی منزلت گھٹی۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ انسان کو اس کا احساس بھی باقی نہیں رہتا کہ یہ نعمت کچھ نعمت بھی ہے یا نہیں اگر غیرت بیگم کو ذرا بھی عقل ہو کہ خدمت اور اطاعت سے میاں کو اپنا کرنا چاہیے تو ہریالی کی اتنی بھی قدر نہ ہو یہ اپنی صورت کو آئینہ لئے ٹیٹھی چاٹا ہی کرے اور اندر باہر غیرت بیگم ہی غیرت بیگم رہے مگر وہ چال بری چلی۔ اس نے چاہا تو ٹوڑوں سے دباؤ بھائیوں کی حمایت سے بتا کے دل میں جگہ کر لی۔ نہ خوب صورتی کے برتے پر بلکہ سلیقے اور رضا جوئی کے بل پر غیرت بیگم کے جھگڑے بتا کو چین تو لینے دیتے ہی نہ تھے۔ وہ ہریالی کی خوشی کیامنا تا دونوں میں میل جور با مگر عاشق معشوقی کا سامنا نہیں بلکہ جیسا کہ عام طور پر میاں بیویوں میں ہوا کرتا ہے۔

بتانا نے تنگ ہو کر دونوں گھروں میں رہنا چھوڑا اور اس کی حالت یو مانیو مادی ہوتی گئی یہاں تک کہ ایک دن مر کر رہ گیا

جس شخص کی پینسٹھ کی آمدنی جا کر ستائیس کی رد جائے اور وہ بھی غیر مقرر راسی کے دل سے پوچھنا چاہیے کہ اس پر کیا گزرتی ہوگی۔ تو اثر مصائب اور ہجوم افکار نے بتانا کو اس قدر تنگ مزاج کر دیا تھا کہ دنیا کی کوئی چیز اس کو بھلی نہیں لگتی تھی۔ اس کو ہریالی سے لڑائی کا ایک بہانہ مل گیا اور اس نے دونوں گھروں کا جانا کلیتہاً موقوف کر دیا۔ سارے دن رات اٹوانٹی کھٹوانٹی لیے اکیلا امر دانے میں پڑا رہتا تھا نہ خود کسی کے پاس جاتا اور نہ اپنے پاس کسی کے آنے کا روادار ہوتا۔ اگر اتفاق سے کوئی آنکلتا تو اس کی طرف مطلق ملتفت نہ ہوتا۔ اس رنج نے اس کو رہا سہا اور بھی اچھوڑ کر دیا کہ دو دشمن اس کے اور تیار ہوئے۔ ناظر سے بڑھ کر معصوم اور غیرت بیگم سے زیادہ بتول۔ بتانا اپنی طرف سے بہتیرا دونوں کو لپٹتا تھا مگر یہ دونوں اتنا بھی نہیں جانتے تھے کہ ہمارا باپ ہے۔ جب سے ہوش سنبھالا کو سنا براہ پلس دونوں کے ذہن میں اس کی برائی ایسی راسخ ہو گئی تھی کہ ابابا باوایا باپ کہنا کیسا دونوں خاص طرح نام لیتے تھے۔ معصوم گالی کے اور بتول کو سننے کے ساتھ بتانا نے جب دونوں گھروں سے ملول ہو کر مردانے میں رہنا اختیار کیا تو اس نے یہ خاصی تدبیر سوچی تھی اگر ہو سکے تو معصوم اور بتول دونوں کو ورنہ اکیلے معصوم کو خالی بیٹھا ہوا پڑھاؤں اور اسی طرح اپنا جی بہاؤں مگر معصوم پٹھے پر ہاتھ دھرنے ہی نہیں دیتا تھا۔ مردانے مکان میں بے رونقی تو ہریالی کے ساتھ آچکی تھی۔ اب تھوڑے ہی دن میں خاک اڑنے لگی جس مکان میں عمو اسباب کے اٹم کے اٹم لگے پڑے تھے اب اس میں کیا رہ گیا۔ بانوں کے چند جھلگنے ایک کی چول ٹوٹی ہوئی ہے تو دوسرے میں ادوان نہیں کسی کی پٹی پچکی ہوئی ہے تو کسی کے سروے میں جان نہیں شاید چھوٹی بڑی ملا کر چار یا پانچ چوکیاں وہ بھی بے جوڑ بوسیدہ بے مصرف نوکروں میں صرف ایک وفادار سو وہ بھی کس طرح کہ یہاں سے تو اس کو کھانا تک نہیں ملتا تھا اور ملے کہاں سے دیں نہ دیں یہاں سو بے چارے کے کپے لگانے میں دن کو مزدوری کرتا اور رات کو یہاں کی پابینتی آ کر پڑ رہتا دنیا کا کوئی کام یا دین کا روز و نماز ہو تو صبح و شام کا تفرقہ اور دن رات کا امتیاز ہو بتانا کو سب وقت یکساں تھے۔ اس کو سونے جا گئے کھانے پینے کسی بات کا کوئی وقت ہی مقرر نہ تھا۔ جب دیکھو منہ اندھا کیے چار پائی پر پڑا ہے۔ معلوم نہیں سوتا یا جاگتا ہے۔ اپنی تباہی کا خیال ہے کہ کسی وقت دل سے نہیں جاتا۔ جاگتا ہے تو اس کی سوچ ہے اور سوتا ہے تو اسی کا خواب

دیکھ رہا ہے۔ وہ کبھی اپنے پچھلے وقتوں کو یاد کرتا اور اس کے چہرے پر ایک طرح کی ہنستا آجاتی، تھوڑی دیر بعد خود بخود  
 ریکا ایک چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگتا اور پھر اس کے منہ پر مردنی سی چھا جاتی، غیرت بیگم اور اس کے علاوہ داروں سے  
 یہاں تک کہ اپنے بچوں سے تو اس کو مطلقاً امید تھی۔ وہ خوب سمجھ چکا تھا کہ اب کسی حالت میں جیتے جی ان لوگوں سے  
 صفائی کا ہونا ممکن نہیں۔ وہ گیارہ قطع تعلق اس کے لیے چاہیے بہت جرأت اور یہی باتیں اگر بتلا میں بوتیں تو یہاں تک  
 نوبت ہی کیوں پہنچتی۔ قاعدہ بے کہ جس پر پڑتی ہے۔ اسی کی طبیعت خوب لڑتی ہے۔ رنجوں سے بچنے کا کون سا پہلو تھا۔  
 جو بتلا نے نہیں سوچا مگر جدھر جاتا تھا راجات کو مسدود پاتا تھا۔ مارے غم کے وہ اس قدر نحیف و ناتواں ہو گیا تھا جیسے کوئی  
 برسوں کا بیمار شاید چھینکنے سے اس کو نش آتا اور کھانسی کے ساتھ اس کا سانس اکھڑ جاتا۔ اللہ رے غیرت بیگم عورت ذات ہو  
 کر اس قدر سخت دلی اور اس بلا کا غصہ کہ بتلا گھلتے گھلتے چار پائی سے لگ گیا اور اس نے بھول کر بھی خبر نہیں لی۔ ہریالی تھی تو  
 رزالی پر خیر دکھاؤ ظاہر داری جو چاہو سمجھو میسوں بار تو اپنی ماما کو بھیجا اور آخر خود گئی ہر چند منت خوشامد کی مگر بتلا تو اپنی زندگی  
 سے ہاتھ دھوئے بیٹھا تھا ذرا نہ پیتا۔ بتلا خوب سمجھتا تھا کہ میں اس رنج سے جان برباد نہیں ہو سکتا۔ اختلاج قلب تو اس کو  
 مہینوں سے تھا۔ اب کسی وقت میں ایک طرح ہکا ہکا درد بھی اٹھنے لگا۔ تدبیر کچھ ہوئی نہیں دورے متواتر اور شدید ہونے  
 لگے۔ آخر ایک دن ادھر آفتاب ڈوبتا تھا۔ ادھر یہ بے کس و بے نصیب دل کے درد سے کمری چار پائی نہ تکیہ نہ بچھونا تڑپ  
 کمر سرد ہو گیا۔

## خاتمہ

ایک حسن پرستی کے پیچھے دنیا میں کیا کیا سختیاں اٹھائیں کہ خدا دشمن کو بھی نصیب نہ کرے۔ اپنا بیگانہ مرنا تو سبھی کا قابل افسوس ہے مگر نہیں تو بتلا کا اس کا جینا قابل افسوس تھا اور مرنا قابل خوشی۔ کیونکہ مرکرو دنیا کی مصیبتوں سے تو چھوٹ گیا۔ مصیبتیں تو اس کے دم کے ساتھ تھیں۔ نہ مرتا اور مصیبت بھرتا پھر بھی ہم اس کے حق میں دعا کرتے ہیں۔ کہ دنیاوی ایذاں اس کے گناہوں کا غارہ ہوں اور بے چارہ مصیبت کا مارا حسن صورت کا بہت فریفتہ تھا۔ خدا اس کو جنت میں بہت سی حوریں دے بشرطیکہ غیرت بیگم اور ہریالی کی طرح آپس میں نہ لڑیں۔ عبرت کا مقام ہے۔ ایک چھوڑ دو دو بیبیاں موجود بیٹا موجود بیٹی موجود بیبیوں کے نوکر چاکر موجود اور مرتے وقت منہ میں پانی ٹپکانے کو بتلا کے پاس کوئی نہیں۔ کہیں پہر رات گئے وفادار محنت مزدوری سے فارغ ہو کر آیا اور اس نے پکارا تو میاں کو مرا ہوا پایا۔ چیخ اٹھا سارے محلے کو خبر ہوئی اور محلے والوں کے ساتھ محل کے لوگوں نے ہریالی کو دیکھا تو وہ اور اس کی ماما اور اسباب سب نہ ارد۔ گھر میں جھاڑودی ہوئی پڑی ہے۔ نہیں معلوم ایسا کون کالا چور اس کو بھگا کر لے گیا کہ پھر اس کا پتہ نہ لگا۔ غیرت بیگم یا تو اس قدر میاں سے اکڑی رہتی تھی یا میاں کا مرتا سنتے ہی ایسا روئی اتنا پیٹی کہ بس خود میاں بیوی کی عاشق زار ہو گئی وہ بھی اس سے زیادہ دیکھا روئے پیٹے گی۔ اب اس کو معلوم ہوا کہ میاں اس کا ظلم سہنے کے لیے سدا کو بیٹھا رہنے والا نہ تھا۔ وہ میاں کے مرنے پر اتنا نہیں روتی تھی جتنا اپنے ظلموں پر جن کی تانی اب کچھ اس کے اختیار میں نہ تھی۔ روتے روتے دونوں آنکھوں میں ناسور پڑ گئے تھے۔ اور ہنسنی جیسا ڈیل ایسا سوکھا تھا کہ جیسے کانٹا۔ بتلا کی چھ ماہی بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ غیرت بیگم اسی رنج میں تمام ہوئی۔ مرتے مرتے وصیت کی کہ مجھ کو بتول کے باپ کی پائنتی فن کرنا تاکہ اگر جیتے جی میں ان کے پاؤں نہ پڑ سکی تو خیر قبر میں ان کے پاؤں ہوں اور میرا سر۔

## مرثیہ

دنیا عجیب مرحلہ ہے ثبات ہے  
ہر ایک ذی حیات کو آخر ممات ہے  
دن ہے تو دن کے بعد بلاشبہ رات ہے  
جس کو فنا نہیں ہے وہی ایک ذات ہے  
بیٹھی ہے موت تاک لگائے کہیں میں  
لے جائی گی آخر یہ کھینچ کے زمین میں  
ایسا مکان بتاؤ کہ بن کر گرا نہ ہو  
پیدا ہوا ہے کوئی بشر جو مرا نہ ہو  
ہے کوئی حال جس میں تغیر ذرا نہ ہو  
حادث نہ ہو تو مدخل چوں و چرا نہ ہو  
فانی ہر چیز ہے فانی جہاں ہے  
مقصود اس فنا سے مگر امتحاں ہے  
اعمال نیک ہیں تو زمرہ کے ہیں قصور  
خدمت میں اونڈیوں کی جگہ دست بستہ حور  
ہر طور کا عیش تو ہر طرح کا سرور  
یعنی خلاصہ یہ ہے کہ راضی ہوئے حضور  
خوشنودی خدا ہی عبادت کا دام ہے  
جنت بھی اک رضائے الہی کا نام ہے  
اور ہیں عمل برے تو ہوئی عاقبت خراب  
ایذائیں طرح طرح کی اقسام کے عذاب  
اور سب سے بڑھ کر خالق کونین کا حساب

گر پوچھنے پر آلے تو کیا بن پڑے خواب  
 حق کو جو ناپسند ہو تنہا ایسے کام پر  
 مالک ہی خوش نہیں ہے تو لعنت غلام پر  
 توفیق کار نیک ہمیں اے کریم دے  
 دل میں صلاح دے ہمیں طبع سلیم دے  
 شوق سلوک جاوے مستقیم دے  
 ایمان درمیانہ امید و بیم دے  
 ہم کو نہیں ہے بحث عذاب و ثواب سے  
 تیری رضا ملے ہمیں تیری جناب سے  
 اٹھ جائے دل کی آنکھ سے اسباب کا حجاب  
 دنیا دکھائی دینے لگے نقش طمع آب  
 ذرے میں رونما ہو حقیقت کا انتخاب  
 لاریب! فیہ ہو خیر ذالک الکتاب  
 کھل جائے اصل راز حیات و ممات کا  
 ہو ایک حال ماضی و مقبالات کا  
 دل لوث حب دولت دنیا سے پاک ہو  
 دے وہ غنا کہ آنکھ میں اکسیر خاک ہو  
 لالچ ہو فائدے کا نہ نقصان پاک ہو  
 دین سے شفقت ہو دین میں ہی انہماک ہو  
 فرق نیاز فرش زمین پر پڑا ہو  
 ہمت کا پاؤں عرش بریں پر گڑا ہو  
 ہر دم خیال موت کا پیش نظر رب  
 جب تک جئے جئے جب اجل آئی مر رب



رد رو ہمیشہ چاہیے باندھے کمر رب  
 دنیا وطن نہیں ہے کہ آئے سپر رب  
 آئے ہیں ہم جہان میں تو جانا ضرور ہے  
 سارا ہی قافلہ سر راہ مرور ہے  
 پھر بعد مرگ کیسی بنے کچھ خبر نہیں  
 یہ وہ خطر ہے جس سے کسی کو منہ نہیں  
 پر کیا ہی ڈھیٹ ہم ہیں پر اس کا بھی ڈر نہیں  
 عقل معاد سے ہمیں بہر مگر نہیں  
 رب العباد نعمت فکر معاد دے  
 فکر معاد دے ہمیں ذکر معاد دے  
 کیا جانب خدا سے ہدایت ہمیں نہیں  
 یا سوچنے کو عقل و داریت ہمیں نہیں  
 فی الاصل کچھ ضرورت و حاجت ہمیں نہیں  
 پر ہائے غور کرنے کی عادت ہمیں نہیں  
 ہم دیکھتے نہیں کبھی غائر نگاہ سے  
 سنتے نہیں ہیں بات کوئی اغتباد سے  
 غفلت کرا رہی ہے یہ ہماری شرارتیں  
 بنوا رہی ہے رہنے کو پکی عمارتیں  
 اللہ رے دلیریاں بل بے جساتیں  
 دنیا کمائیں دین کی کر کے خسارتیں  
 غفلت کا کر علاج کر اصل مرض ہے یہ  
 تیرا ہی کچھ بھلا ہو ہماری غرض ہے یہ  
 غفلت نہ ہو تو کینہ و بغض و حسد نہ ہو

جھگڑا نہ ہو لڑائی نہ ہو رد و کد نہ ہو  
 بھائی کی پیٹھ پیچھے کبھی ذکر بد نہ ہو  
 انسان مشارک صفت دام دود نہ ہو  
 غفلت سے اس جہاں میں سارا فساد ہے  
 غفلت کو آؤ مار مٹائیں جہاد ہے  
 مخلوق ذی شعور ہے تو ہوشیار رہ  
 مت مسمند زندگی مستعار رہ  
 دنیا کا کاروبار کر اور دین وار رہ  
 امیدوار رحمت پروردگار رہ  
 کس نے کہا تجھ سے کہ دنیا کو چھوڑ بیٹھ  
 بس ایسی باتیں اپنی طرف سے نہ جوڑ بیٹھ  
 کیا حال تھا رسولؐ علیہ السلام کا  
 اصحابؓ کا ائمہ عالی مقام کا  
 سرکردہ ہائے امت خیر الامام کا  
 سکہ بٹھائے گئے جو محمدؐ کے نام کا  
 ان میں سے ایک بھی کبھی یہ رابب ہوا کوئی  
 دنیا کو کھو کے دین کا طالب ہوا کوئی  
 دنیا بھی کچھ ہماری طرح کی نہیں ذلیل  
 اگر سو گھروں میں دیکھو گے تو ننانوے رذیل  
 روٹی کی بابزار مشقت ہوئی سبیل  
 کپڑے کے واسطے ہی ستا رب کفیل  
 گرمی کے دن تو خیر کسی ڈھب گزر گئے  
 جاڑا جو آیا رات کو سکڑے ٹھڑ گئے

افلاس سے زیادہ جہاں میں نہیں وبال  
 افلاس سے مقدمہ قہر ذی الجلال  
 افلاس کر رہی دیتا ہے انسان کو پامال  
 ڈراپوک پست ہمت ست رو فی خیال  
 مفلس کہ اس غریب کی دنیا نہیں درست  
 مشکل کہ اس کے ہاتھ سے ہو کار دیں دست  
 اور شاد اگر ہوا کوئی محتاج دل غنی  
 سمجھا کہ یہ جہاں ہے جہاں گزشتی  
 کے دن کی زندگی کے لیے اتنی سرزنی  
 اس کو نہ دوستی ہے کسی سے نہ دشمنی  
 ایسا بزرگ شک نہیں اس میں کہ نیک ہے  
 پر قوم کو ہوا نہ ہوا دونوں ایک ہے  
 سوچو تو کچھ بھی نیست کو نسبت ہے ہست سے  
 تم چاہتے ہو کام بلندی کا پست سے  
 کیا خیر ہو سکے گی بھلا تک دست سے  
 کوڑی تو لے ادھار کوئی فاقہ مست سے  
 کیا اس سے فیض ہو کہ نہیں آپ جس کے پاس  
 دنیا میں چیل سے بھی ملا ہے کسی کو ماس  
 گر مجھ سے پوچھتا ہے حقیقت میں ہمیشیں  
 ایصال نفع ہے مرے نزدیک اصل دین  
 پر چاہیے ہے اس کے لیے نقد آستین  
 خرمن بیار خوبہ کہ بسیار خوشہ چین  
 دین کے درست کرنے کو دنیا ضرور ہے

دنیا نہیں تو دعویٰ دیں کرو زور بے  
 اس واسطے جو معشر خیر القرون ۵ تھے  
 اور کلام عمارت دیں کے ستون تھے  
 امت کو کالجوم ۶ بھی رہ نمون تھے  
 اور مرجع ضمیر نعم المستعدون تھے  
 دنیا میں رہ کے دین کا برتنا سکھا گئے  
 دونوں کے جمع کرنے کا رستہ دکھا گئے  
 راوی نے یوں لکھا بے جناب عمرؓ کا حال  
 جن روزوں آپ امیر تھے یا ہیبت و جلال  
 اپنے ہی دست خاص سے پا تھا کئے شمال  
 تاریخ میں دکھائیے ایسی کوئی مثال  
 شاگرد تھے نبی کے پیمر کے تھے جلیس  
 دنیا کو جانتے تھے پریشہ نہیں  
 لیسر ان کا تھا فراغ عبادت کے واسطے  
 کی سلطنت فلاح رعیت کے واسطے  
 عزت طلب کرتے تھے دین کی عزت کے واسطے  
 القصہ جو وہ کرتے تھے امت کے واسطے  
 ان کو کسی طرح طمع سیم و زر نہ تھی  
 ہرگز نہیں مفاد پر اپنے نظر نہ تھی  
 فیضان صحبت نبوی سے تھے مستفید  
 دیکھا انہوں نے نور رسالت کو چشم دید  
 پیدا ہوئے سعید بنے اور مرے سعید  
 تھی ان سے خواستگاری دنیا بہت بعید

لیکن یہ انتظام الہی ہے مہربان  
 چڑھتا ہے بام پر کوئی بے وضع نروبان  
 زاہد تھے اور ملک ستانی کا اہتمام  
 دیکھو اگر یقین نہ آئے فتوح شام  
 دنیا میں ان کی دین کا تھا لمح فی الطعام  
 دونوں کا پاس کرتے تھے قصہ ہوا تمام  
 بدلا اسی سبب سے زمانے کا طور ہے  
 اسلام جب کا اور تھا اور اب کا اور ہے  
 دنیا سے ان کو ہوتی ذرا بھی اگر گریز  
 اسلام کی تو ہو ہی چکی ہوتی دست خیز  
 کھا جاتے لوگ گھور کے آنکھوں سے تیز تیز  
 تب دیکھتے زمانے کی کج دار اور مریمے  
 پھر کون پوجتا تھا خدائے یگانہ کو  
 پاتا نہ کوئی زندگی جاودانہ کو  
 اب بھی جو دیکھتے ہو ان ہی کا طفیل ہے  
 کم بیش سب کو جانب توحید میل ہے  
 اعمال و شرک چوں خس و خاشاک و سیل ہے  
 اتنا بھی گر نہ سمجھے تو انسان نیل ہے  
 مشرک کی کوئی شے نہیں کرتا خدا قبول  
 اس کی دعا قبول نہ کچھ التجا قبول  
 القصہ اک وہ دین تھا دنیا کا دوست دار  
 واعظ ادیب ناصح مشفق صلاح کار  
 مؤنس رفیق موجب تسکین غم گسار

ہم درد بے ریا و ہوا خواہ جان نثار  
 وہ کھینچتا تھا بارہا امیر و فقیر کا  
 دنیا میں اس میں ربط تھا شاہ و وزیر کا  
 اب ہم نے اپنے دین کو بنایا چھوٹی موٹی  
 دنیا میں اور دین میں لگانے لگے دوٹی  
 پھر قاصر اس قدر نظر نارسا ہوئی  
 شہتیر بن گیا جو حقیقت میں تھی سوئی  
 دین کے عوض تعصب و اوبال رد گئے  
 ریں دار اصل مر گئے بدنام رد گئے  
 دنیا گئی کہ ہم نہ ہوئے اس کے خوش گار  
 اور کیوں کر ہوتے مولوی جنت کا چوہدار  
 مسجد میں وعظ کہتا تھا منبر پر آشکار  
 مفلس امیر مومن و دوست از طلب بدار  
 دنیا و دین کے ربط کی رسی کو کاٹ کے  
 دھو بی کے کتے ہو گئے گھر کے نہ گھاٹ کے  
 ادبار کا یہی تو سب سے بڑا سبب  
 دنیا میں اور دین میں عداوت ارے غضب  
 دنیا بغیر سکتی مصیبت ہے روز و شب  
 لازم ہے دین کا بھی کماحقہ ادب  
 خستہ ہوئے خراب ہوئے ہائے مٹ گئے  
 ان دونوں کی لڑائی میں ہم مفت پٹ گئے  
 دل بچھ گیا ہے دیکھ کے دنیا کا انقلاب  
 افسوس کیا خراب ہوئی قوم انتخاب

دین کے خدا پرست وہ دنیا کے فتح یاب  
 آپس میں رحم و لطف عدو کے لیے عذاب  
 مسجد میں سر بہ جبدہ پڑے ہیں زمین پر  
 میدان میں ڈٹے ہوئے ہیں گھوڑوں کی زین پر  
 لوگوں کو گر مناسب دینا گناہ ہوں  
 داخل محرمات میں اعزاز و جاہ ہوں  
 دنیا کی آبرو سے اگر دیں تباہ ہوں  
 ان کا تو دیں یہی تھا کہ ہم بادشاہ ہوں  
 اگلے بزرگ لوگ تھے خاص امتیاز کے  
 پیشانیوں پر ان کے تھے گھٹے نماز کے  
 معمور ہیں خزان انعام کرو گار  
 بے انتہا و بے خد و بے حشر و بے شمار  
 وہ چھینتا نہیں بے کبھی دے کے ایک بار  
 شایاں اسے نہیں بے کہ بندوں کو دے ادھار  
 دنیا بدل گئی ہمہ نعمت بدل گئی!  
 اس واسطے کہ قوم کی ہمت بدل گئی  
 افسوس قوم میں عصبيت نہیں رہی  
 ہم میں کسی طرح کی مزیت نہیں رہی  
 مضبوطی ارادہ و نیت نہیں رہی  
 جرات کہاں سے ہو حمیت نہیں رہی  
 ہم میں ہر ایک بشر کے خیالات پست ہیں  
 پس لا جرم ذلیل ہیں اور یگدست ہیں  
 اے قوم یہ تباہی و افلاس جائے شرم

اے قوم یہ تعصب و وسواس جائے شرم  
 اس درجہ ضعف قوت احساس جائے شرم  
 تقصیر فی مقابلۃ الناس جائے شرم  
 تم اور تمہاری نسل ہو مشغول کھیل میں  
 اور لوگ چل رہے ہیں ترقی کی ریل میں  
 کیا خوب کہہ گیا ہے کوئی شخص خوش خیال  
 لفظ عرب میں حسن رجال دہم رجال  
 اب اے عزیزو تم سے ہمارا یہ سوال  
 کیوں آگیا ہے قوم کی حالت میں اختال  
 اقوام روزگار میں بیٹے ہو کس لیے  
 بے وقعتی کی خاک پہ لپٹے ہو کس لیے  
 کثرت سے تم میں صاحب مقدر کیوں نہیں  
 اوبا تمہارا مانتے جمہور کیوں نہیں  
 منہ پر تمہارے حسن نہ ہو نور کیوں نہیں  
 دل قوم کے شکفتہ و مسرور کیوں نہیں  
 آخر تمہاری قوم پہ یہ کیا وبال ہے  
 جس شخص پر خیال کرو خستہ حال ہے  
 جب تک ہماری قوم میں تاج و سنگیں رہا  
 ہم میں کسی کو فکر معیشت نہیں رہا  
 کس کس کا نام لیں کہ چناں اور چنیں رہا  
 ہر فرد عافیت سے غنا کے قریں رہا  
 ہم مالک خزانے روئے زمین تھے  
 اہل زمانہ طبعیہ خوشہ چیں تھے



لیر و فراخ حشمت ہزار حیف  
 وہ شوکت اور اوازم شوکت ہزار حیف  
 عزت ہزار حیف حکومت ہزار حیف  
 صد حیف قابلیت نعمت ہزار حیف  
 گو حور بعد کور ۱۳ اشد العذاب ہے  
 یا از قبیل ۱۴ لیت یعود الشاب ہے  
 کیا فائدہ جو تذکرہ مامصہ ۱۵ کریں  
 کیوں یاد رننگان میں ماتم بپا کریں  
 بے سود اگرچہ تابہ قیامت بکا کریں  
 اک امر اختیار سے خارج ہے کیا کریں  
 فرہاد دارد رسد و جوئے شیر کیا  
 اب جا چکا ہے سانپ تو پیٹیں لکیر کیا  
 پھر بھی اک وجہ تسلی بہت بڑی  
 قسمت ہمارے ملک کی اچھوں سے جا لڑی  
 جن کو فلاح خلق ہے منظور ہر گھڑی  
 لیکن یہ مشکل ایک بڑی سخت آ پڑی  
 فاوا جب اڑ کے بیٹھے ہیں ہم اپنی بات پر  
 پیاسے تڑپ رہے ہیں کنار فرات پر  
 دروازہ کونسا ہے جو ہم پر کھلا نہیں  
 ناممکن الحصول کوئی مدعا نہیں  
 مذہب کا قوم و ملک کا یا تفرقہ نہیں  
 آزادی اس قدر ہے کہ کچھ انتہا نہیں  
 بے جوتے بوئے آپ اگے کا اتان کیا

ہم ہی اگر نہ چاہیں تو اس کا علاج کیا  
 اس ضدِ احمقانہ کو اللہ کم کرو  
 جانوں پر اپنی بہرِ خدمت ستم کرو  
 چاہو ہمیں برا کہو یا مہتمم کرو  
 پر روٹیوں کا فکر تو ہے بہرِ شکم کرو  
 بیمار کو دوا نہ بتائیں گناہ ہے  
 پھر بھر تم ہی تم ہو اگر دل پہ ٹھان لو  
 وہ وقت اب نہیں ہے کہ سیف و سنان لو  
 ہے علم پر مدار اسے خوب جان لو  
 اتنی سی ایک بات ہماری بھی مان لو  
 رکھتی ہے اپنا وقت مناسب ہر ایک شے  
 تسوئف تا کجا و پس و پیش تاہ کے  
 جاگو کہ شرطِ باندھ کے مردوں سے سو چکے  
 خارِ قنوط راہِ تمنا میں ہو چکے  
 جو کچھ تمہیں خدا نے دیا تھا سو کھو چکے  
 سن لینا ایک دن کہ مسلمان ہو چکے  
 قسمت میں قوم کی ہے لکھی صبح و شام موت  
 بے حرمی کے جینے سے بہتر حراموت  
 دنیا میں جس قدر ہیں ذریعے معاش کے  
 ان میں ہمارا حصہ واجب ہو کاش کے  
 پودے ہیں جستجو کے طلب کے تلاش کے  
 ہاں بتانا کی وضع کے اس کی قماش کے  
 گر چاہیے تو لاکھ میں نوے ہزار میں

طوطی چمن میں ایک بنے کوئے ہزار ہیں  
 عبرت کی داستان بنے احوال بتا  
 آنکھوں کے آگے پھرتی بنے تیشال بتا  
 اللہ رے جمال خدوخال ۱۸ بتا  
 اور غنغوان عمر سن و سال بتا  
 جس وقت وہ شراب جوانی سے چور تھا  
 بے شک وہ شبیہ روکش غلام و حور تھا  
 لیکن وہ حالت ایسی سرچ الزوال تھی  
 بس دیکھتے ہی دیکھتے خواب و خیال تھی  
 وہ زلف جو کبھی دل عاشق کا جال تھی  
 خود دوش بتا پے بلا تھی وبال تھی  
 دیکھا تو آخرش خورش گرم گور تھا  
 جس کے جمال و حسن کا عالم میں شور تھا  
 وہ بتا جو ناز و نعم میں پلے کبھی  
 سانچے میں ہاتھ پاؤں تھے جس کے ڈھلے کبھی  
 خنجر چلیں گر ایک قدم بھی چلے کبھی  
 تیغ ادا سے کٹتے تھے جس کے گلے کبھی  
 بس جنتری میں قبر کی سب بل نکل گئے  
 رکھتے کے ساتھ محلہ کے سانچے میں ڈھل گئے  
 آفت سے موت خاصیت بتا کی موت  
 تکلیف دور دود مخمہ و رنج و غنا کی موت  
 قبر الہی و غضب کبریا کی موت  
 دشمن کو بھی نصیب نہ ہو اس بلا کی موت

انجام کار جو تری مرضی ہو کچھ  
 پر ایسی موت بار خدایا نہ دیجیو  
 تھی اس پہ ابتدا سے مسلط ہائے حسن  
 طفلی میں تھا وہ آئینہ رونمائے حسن  
 مضر ہر اک وضع میں اس کی ادائے حسن  
 اک عالم اس کا شیفۃ و بتائے حسن  
 اول سے شوق حسن جو خاطر شان ہوا  
 خواباں روئے خوب ہوا جب جواں ہوا  
 شامت جو اس کی آئی کیا دوسرا نکاح  
 سمجھا کہ چار شرع پیغمبر میں ہیں مباح  
 آئی مگر نظر نہ کبھی صورت فلاح  
 کیا ہی بری وہ رائے تھی اور کیسی بدصلاح  
 فرصت نہ دی پھر اس کو نزاع و جدال نے  
 سب کچھ حرام کر دیا اس اک حال نے  
 امن و فروغ و عاقبت و راحت و قرار  
 نام و نمود عزت و توقیر و اعتبار  
 حسن معاشرت کہ تمدن کا بے مدار  
 اور جس سے بے نیاز نہیں کوئی خانہ دار  
 سب چیز جا کے فقر ہوا گھر میں جاگزیں  
 جس چیز کو مکان میں پوچھو نہیں نہیں  
 جب بتلا پر آہی گیا وقت اختصار  
 منہ میں چوانے پانی لگی چشم اشکبار  
 یسین پڑھ رہی تھی کھڑی یا نمگسار

اور دونوں آنکھیں نے دیں ڈھانک ایک بار  
یوں بے کسانہ ہائے جوانی میں جان دے  
جنت میں اس کو بار الہا مکان دے  
جو لوگ ہیں سعات منظمی سے بہرہ مند  
کرتے ہیں بات بات سے وہ کتاب اکتساب چند  
پرواز کے خیال کو رکھو ذرا بلند  
مت ہو لذائذ نفسانی کے پائے بند  
وہ پیماں نہ کیجئے زہار بھر کر  
میری سنو اگر نہیں شمع قبول کر